ترجمہ کاری

ڈاکٹر فاخرہ نورین

ادارۂ تحقیقاتِ اردو

اسلام آباد

تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں ۔

مصنف کے خیالات سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں ۔

فیس بک گروپ

کتابیں پڑھئے

ایڈمن ۔ سید حسین احسن

0344-818-3736

0314-595-1212

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ کاری

ڈاکٹر فاخرہ نورین

ادارۂ تحقیقات اردو
اسلام آباد

نبیؐ کی رہنمائی

اور

دنیا میں سب سے پیارے بچے

محمد ابراہیم ضیاء

کے نام

میں نے خوشی اور امید انھی دو ناموں کی شکل میں دیکھی ہے۔

فہرست

پیش لفظ

ترجمہ محض لسانی عمل نہیں ہے،اسے تخلیقی اور ثقافتی عمل بھی کہا جانا چاہیے۔ترجمے کے ذریعے صرف ایک زبان ،دوسری زبان میں اپنے متبادلات و مترادفات تلاش نہیں کرتی ، بلکہ دو ثقافتیں ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتی ہیں؛نیز ایک دوسرے کے عقلی اور تخیلی منطقوں سے آشنا ہوتی ہیں اور حقیقی معنوں میں آفاقی نقطہء نظر کی تخلیق میں ایک دوسرے کا دست و بازو بنتی ہیں۔ترجمہ دلوں کو جوڑتا ہے یا نہیں، کچھ نہیں کہہ سکتے ،مگر دو اجنبی ذہنوں کو اس قابل ضرور بناتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں،اور ایک دوسرے کے خوابوں کے اسرار سے آگاہ ہو سکیں۔حقیقتاً ترجمہ،مترجم کی زبان کے لیے ایک ایسا چیلنج بنتا ہے جس سے نبرد آزما ہو کر مترجم کی زبان اپنی ابلاغی حدود کو وسعت آشنا کرتی ہے۔ زبان کی وسعت خیالات و تخیلات کی وسعت پر لازماً منتج ہوتی ہے۔ایک شہ پارے کا ترجمہ ایک نئے امریکا کی دریافت کی مانند ہوتا ہے۔

اردو میں کلاسیکی مشرقی زبانوں یعنی عربی و فارسی اور کسی حد تک سنسکرت سے اور یورپی زبانوں،خصوصاً انگریزی سے تراجم کی باقاعدہ روایت موجود ہے،مگر خود ترجمہ نگاری کے فن (یا سائنس) پر تحقیقی و علمی کام برائے نام ہے۔چند ایک مرتبہ کتب ہیں،ان میں بھی بیسویں صدی کے اوائل تک کے مغربی تصورات کی شرح ملتی ہے۔البتہ اکا دکا مضامین اردو کے مترجمین نے قلم بند کیے ،جن میں بعض کام کی باتیں ضرور کہی گئی ہیں،مگر بعد میں انھی کی تکرار ہمیں ترجمے سے متعلق مضامین میں ملتی ہے۔گزشتہ ساٹھ ستر برسوں میں ترجمے کی تھیوری پر مغرب میں بہت کام ہوا ہے،خاص طور پر جدید لسانیاتی نظریات کی روشنی میں۔ ان سے آگاہی بھی اردو میں خال خال ہے۔اردو دنیا باقی علمی دنیا سے لاتعلقی میں ایک عجب

سرشاری، بلکہ تفاخر محسوس کرتی ہے؛اسے ہر اجنبی علمی نظریہ اپنی صورتِ حال سے غیر متعلق اور اغیار کی سازش لگتا ہے ۔بنا بریں یہ بات اردو دنیا کے علم میں شاید ہی آئی ہو کہ ترجمے کی سائنس کا گہرا تعلق لسانیات سے ہے۔ترجمہ صوتیاتی ،صرفیاتی،نحوی اور معنیاتی سطحوں پر متبادلات کی تلاش کا نام ہے۔یعنی ترجمہ صرف ایک زبان میں ظاہر ہونے والے خیال کا دوسری زبان میں ترجمہ نہیں؛احساس، کیفیت ،لہجہ،طرز بھی ترجمہ طلب ہوتے ہیں۔اس تناظر میں ڈاکٹر فاخرہ نورین نے ایک اہم موضوع کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب کیا ہے۔

موضوع کا غیر ضروری پھیلاؤ تحقیق کو اس خصوصیت سے محروم کر دیتا ہے،جس کے مطابق تحقیق کا بنیادی فریضہ 'علم کی تخلیق' ہے،نہ کہ محض معلومات کا ڈھیر۔ڈاکٹر فاخرہ نے اس سب مواد کو کتاب میں ٹھونسنے سے گریز کیا ہے جو ان کے علم یا مطالعے میں آیا۔انھوں نے یہ احتیاط کی ہے کہ صرف انھی باتوں کو کتاب میں شامل کیا جائے جن کا راست تعلق موضوع سے ہے۔'راست تعلق' کی رمز بھی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی ۔یہ کوشش کتاب میں جا بجا محسوس ہوتی ہے کہ ادبی ترجمے کو دیگر تراجم سے کیوں کر ممیز کیا جائے۔

اس کتاب میں موضوع کے نظری اور تاریخی پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔یوں اس کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس میں ترجمے کی سائنس سے متعلق جدید مباحث کو پیش کیا گیا ہے ۔نیز تراجم کی مختلف اقسام سے بحث کرتے ہوئے ،ادبی ترجمے کے اصولی مباحث کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے ۔ ہر باب میں اپنی توجہ اپنے بنیادی موضوع یعنی ترجمے کے فن،معیار اور مسائل پر مرکوز رکھی ہے۔انھوں نے انگریزی سے اردو تراجم کی اہم مثالوں کے معیار کا جائزہ،ترجمے کے جدید و مابعد جدید مباحث کی روشنی میں لیا ہے،خاص طور پر لسانیاتی تناظر میں ترجمے کی تھیوری کو مناسب مقامات پر پیشِ نظر رکھا ہے۔ضروری نہیں کہ ہم ان کی تمام باتوں سے اتفاق کریں ۔ یہ اتفاق اس لیے بھی مشکل ہے کہ ہر نیا ترجمہ، نئے متبادلات کی سعی ثابت ہوتا ہے،اور ہر مترجم کے ذہن میں مختلف متبادلات ہوتے ہیں۔شاید اسی لیے

بعض لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ کسی متن کا ترجمہ دراصل اس متن کو نئے سرے سے تحریر کرنے کا عمل ہے۔اہم بات یہ ہے کہ مصنفہ نے ترجمے کے معیارات و مسائل پر بحث کے بعد اپنی رائے بھی درج کی ہے ۔وگرنہ اکثر تحریروں میں خود مصنف غائب اور دیگر مصنفین حاضرو موجود ہوتے ہیں۔اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اسے،صاف ، شستہ،استدلالی نثر میں لکھا گیا ہے۔نیز مصنفہ نے ترجمے کے فن سے متعلق اردو اور انگریزی میں موجود اکثر اہم کتب سے استفادہ کیا ہےاوران کا حوالہ مناسب مقامات پر دیا ہے۔

امید ہے یہ کتاب ترجمے کے اصولی مباحث اور ادبی ترجمے کے معیار و مسائل کے حوالے سے ایک اچھی ،حوالہ جاتی کتاب ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

لاہور

مئی،۲۰۱۴

معروضات

اپنے والد کی خواہش پر پہلے انگریزی اور پھر اردو ادبیات میں ایم اے کرنے کے بعد دوسروں کی طرح میں خود بھی حیران تھی کہ آخراس بعد المشر قین قسم کی تعلیم سے میں کیا کرنے کے قابل ہوسکی ہوں۔مگر ہمیشہ کی طرح میرے والد نے دور کی سوچ رکھی تھی۔نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز کے مرکزی کیمپس میں مجھے ایم فل لیڈنگ ٹو پی ایچ ڈی کرنے بھیج دیا گیا۔یہاں آئی تب بھی میرے سامنے کوئی موضوع یا فیلڈ نہیں تھی۔بس اتنا جانتی تھی کہ نثر میں کچھ کرنا ہے۔اسالیبِ نثر اردو یا تنقید میں سے کوئی ایک میدان میرا مشقِ تحقیق ہوگا،یہی سوچ کر ساختیات اور پس ساختیات جیسے جناتی موضوعات کا مطالعہ شروع کیا۔مگر نگاہِ مردِ مومن سے تقدیریں بدلتی ہیں،ارادے کیا چیز ہیں۔میرے محترم اور شفیق استاد عابد سیال صاحب نے میری (معدوم) ذولسانی مہارت کا استعمال شاید پہلے دن ہی سوچ لیا تھا۔" آپ فنِ ترجمہ پر کام کریں گی"۔انھوں نے جیسے فیصلہ سنایا اور میں نے انکا فیصلہ سنا اور خاموش ہو بیٹھنے کے بجائے پڑھنے اور مواد کی جمع آوری میں لگ گئی۔مقالے کی تحریر وتکمیل کے دوران موضوع سے ہٹ کر لیکن فنِ ترجمہ سے متعلق بہت سا مواد ایسا جمع ہوگیا جس پر لکھا جانا ضروری تھا۔وہی مواد اپنی تحریری شکل میں اس کتاب میں موجود ہے۔

ترجمہ ایک خوبصورت بے گار ہے۔خود مترجم ہونے کے ناتے میں یہ کہنے کا حق رکھتی ہوں کہ ترجمہ کسی کے بچے کو بغیر کسی لالچ اور صلے یا ستایش کی تمنا کی پروا کے پالنے اور پروان چڑھانے کا عمل ہے۔اس بچے کو اپنا بچہ کہنے کا حق تو مترجم کے پاس نہیں آتا البتہ اس بچے میں موجود تمام ترکجیوں اور کوتاہیوں کی بدولت اسے خراب کرنے اور بگاڑنے کی ذمہ داری مترجم ہی کے حصے میں آئے گی۔لیکن مترجم اس محبت کرنے والے دل کی طرح ہمت نہیں ہارتا،تمام الزامات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے،کہ یہ بے گار اس نے خود مول لی تھی۔ہاں مگر یہ

سکون اور خوشی مترجم کی تسکین کے لئے کافی ہوتی ہے کہ اس نے ایک تعمیری اور مثبت کردار ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن پیشہ ور مترجمین کی مثال اس بے بی سیٹر کی مانند ہے جسے بچے کی پرورش کے لئے تنخواہ ادا کی جاتی ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال اسکے دل کی خوشی یا اختیاری عمل نہیں بلکہ اسکے لئے کمائی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ انفرادی طور پر کسی بچے پر محنت کے بجائے کام نمٹانے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ یہی لوگ نہ صرف اپنے ہم پیشہ مترجمین کی بدنامی کا سبب بنتے ہیں بلکہ قارئین کو گمراہ بھی کرتے ہیں۔

اس کتاب میں میری زیادہ تر کوشش یہ رہی ہے کہ مترجم کی اہمیت اور فرائض کی طرف خصوصی توجہ دوں۔ نئے منظر نامے میں قاری کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ قاری مترجم اور ناشر دونوں کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے، لیکن اسکی مرکزی حیثیت کو اصل متن پر کس حد تک اثر انداز ہونے کی اجازت ہے، یہ خیال رکھنا یقیناً مترجم کی ذمہ داری میں شامل ہے، کیونکہ اصل متن اور مصنف سے وفاداری بھی مترجم کے پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ اردو میں فنِ ترجمہ کے مباحث ایک ایسا میدان ہے جس میں ابھی کام شروع ہوا ہے، ان مباحث کو موضوعِ تحریر بنانے کی ضرورت ہے۔

جناب ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کی ممنون ہوں کہ انھوں نے مسوّدے پر نظر ڈالی اور پیش لفظ کے طور پر اپنی تحریر عنائت کی اور ادارۂ تحقیقاتِ اردو کی شکرگزاری واجب ہے جس نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

ڈاکٹر فاخرہ نورین

راولپنڈی

۲؍جون، ۲۰۱۴ء

باب اوّل

ترجمہ: اصولی مباحث

○

ترجمہ: تعریف اور مفہوم

ترجمہ نہایت پیچیدہ تخلیقی عمل ہے۔ ترجمے کی یہ تعریف یقیناً اس کی قدیم تعریفوں کے منافی ہے کیونکہ ترجمے کو محض نقالی اور مفہوم کی ایک سے دوسری زبان میں منتقلی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ذہنی مزدوری اور میکانکی عمل سمجھا جانے والا فن پیچیدہ تخلیقی عمل تو درکنار تخلیقی عمل سے بھی کوسوں دور خیال کیا جاتا رہا ہے۔ ترجمے کی مختلف تعریفوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ترجمے کے ادب میں مقام کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انگریزی میں ترجمے کا ہم پلہ لفظ Translation ہے جس کا اردو مفہوم 'پار لے جانا' کا ہے۔ گویا مترجم خیال و معانی کو ایک زبان کے کنارے سے دوسری زبان کے کنارے تک لے جاتا ہے۔ معانی و مفاہیم کو پار لے جانے کا یہ عمل اصل مصنف کے اسلوب اور لسانی خلاقی کو دوسری زبان میں پار لے جاتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ ترجمہ ایک زبان کی راکھ سے دوسری زبان کو حیات بخشنے کا عمل ہے۔ کسی فن پارے کے ترجمہ یا قابلِ ترجمہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فن

پارہ اپنے نقلِ مفاہیم کی کامیابی سے قطع نظر، زندگی پا جائے گا لیکن اصل متن کی زبان یا ماخذ زبان دراصل اپنے ذائقے اور رس کو دوسری زبان میں نہیں دکھا پائے گی اور یوں اس زبان کی حلاوت اور اسلوب کی متنوع جہات ترجمہ کرنے والی زبان میں راہ نہیں پاسکیں گی اور یا پھر نئی زبان کے پیکر میں یوں ڈھل جائیں گی کہ اصل زبان کی موت واقع ہو جائے گی۔ سوزن بیسنٹ کے مطابق ترجمہ ایک متن کی بعد ازموت دوسری زندگی کا ضامن ہوتا ہے اور دوسری زبان میں ایک نیا اصل بھی۔ یوں ترجمہ کسی متن کی بقا کا باعث بنتا ہے۔

مرزا حامد بیگ فنِ ترجمہ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں: ''ایک برتن سے دوسرے برتن میں انڈیلنا ایک پرانی شراب کو نئی بوتل فراہم کرنا ہے۔''[۱]

اس نئی بوتل میں پرانی بوتل کی شباہت، جسامت اور سائز کی عکاسی کس حد تک ضروری ہے، یہی ترجمے کی مشکلات ہیں۔ مگر اتنا تو طے ہے کہ اس بوتل کا ہر ممکن تک شفاف ہونا لازم ہے تا کہ انڈیلی گئی شراب کا اصل رنگ و روپ نظر آئے۔ ترجمہ نہ تو فنی نہ ہی تخلیقی لحاظ سے کسی عزت و تکریم کا باعث ہوتا ہے مگر ترجمہ کاری محض نقالی نہیں نہ ہی میکانکی عمل ہے۔ خصوصاً جب بات افسانوی متن کے ترجمہ کی ہو تو ترجمہ محض ایک زبان سے دوسری زبان میں متن کی منتقلی ہی نہیں بلکہ متون اور ثقافتوں کے درمیان مذاکرات کا عمل ہے۔ ایک ایسا عمل جس میں ہر طرح کی منتقلی کے ثالث کے فرائض مترجم سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ محض خطِ راست میں کیا گیا نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت عمل ہے جس میں یہ خیال بھی رکھنا پڑتا ہے کہ اصل متن سے کیا کیا کامیابی سے منتقل ہوا اور یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کیا کیا منتقل نہیں ہو پایا۔ چنانچہ ترجمہ محض اصل مصنف اور متن سے وفاداری اور ہم پلہ الفاظ کی فراہمی ہی نہیں ہے بلکہ ترجمہ شدہ متون کی اہمیت، جدت اور تنوع میں ان کے کردار کا ازسرِ نو جائزہ بھی ہے۔

ترجمے کی اہمیت

تاریخ اسلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ایک مشترکہ میراث ہے۔ زبانوں کی

تفریق سے قطع نظر بنوامیہ اور بنوعباس کے ادوار میں دار ہائے ترجمہ موجود تھے۔علوم وفنون کی وسعت ، جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم میں پیشرفت کے بغیر ترقی محض دیوانے کا خواب بن گئی ہے۔ یہاں تک کہ جو ملک جتنا ترقی یافتہ ہے وہ ترجمے کے عمل پر اتنا ہی زیادہ زور دیتا ہے تا کہ دیگر اقوام کے نظریات ،افکار اور علوم کو اپنی زبان میں ڈھال سکے۔

چنانچہ ترجمہ کی اہمیت اور ضرورت ہر دور سے زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ دور گلوبلائزیشن کا دور ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگ سفر کی سہولتیں کم ہونے نیز مزاج میں مقامیت اور قناعت کے عناصر زیادہ ہونے کی وجہ سے شاذ ہی سفر کیا کرتے تھے۔ سفر خصوصی ضرورت یا افتادِ طبع کی بدولت کیا جاتا تھا لیکن موجودہ دور کو ''مہاجرت کا عہد'' قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ رزق کی تلاش، ان دیکھی دنیاؤں کی کشش، باہمی انحصاریت کی بنیاد پر ایک ملک سے دوسرے ملک جانا اب ایک عام سی بات ہے۔ ترجمہ بھی دراصل مہاجرت کا عمل ہے جس میں مقامی/ملکی زبان کے کچھ عناصر تو منتقل ہو جاتے ہیں مگر مقامی مٹی کی بو باس اور ذائقہ منتقل نہیں ہو پاتا۔ سرحد پار لوگوں کی منتقلی ترجمے کے اسلوب کو بڑھا رہی ہے۔ انسانوں کا باہمی ربط زبانوں کے باہمی ربط کا سبب بنا ہے۔اس ترقی یافتہ دور میں مختلف ممالک اور خطوں کی اپنی مقامی اور قومی زبانوں کی تخصیص کے باوجود حیرت انگیز حد تک زبانوں کا تعامل اور اثر پذیری بڑھی ہے۔ عالمی سطح پر طاقتور اقوام کی زبان کے بہت سے الفاظ مقامی زبانوں بلکہ بولیوں ٹھولیوں میں اس طرح جگہ بنا چکے ہیں کہ انھی کا حصہ بن چکے ہیں۔ سائنسی ترقی کے عملی فوائد کے ساتھ ساتھ لسانی استفادہ گلوبل ویلج کی نمایاں خصوصیت ہے۔اسکی چند مثالوں میں کمپیوٹر، پلیٹ فارم، ریلوے، ٹیلی ویژن ،موبائل فون ، میٹنگ ، سیمینار، کانفرنس، بیورو، ایونیو، روڈ، کار، بس، ایئر پورٹ، کانفرنس روم، ہال، لیکچر، سینما، تھیٹر، فلم، سی ڈی پلیئر وغیرہ شامل ہیں۔

دنیا کو ایک گلوب، ایک وحدت کی شکل میں دیکھا جائے تو علم بھی کسی ایک قوم کی میراث نہیں ٹھہرتا۔ چنانچہ اکیسویں صدی میں مترجم کی حیثیت بھی تبدیل ہوگئی ہے کیونکہ فنِ ترجمہ محض خیال یا فکر کی ترجمانی نہیں رہ گیا ہے بلکہ اب ترجمے میں مترجم کی ''موجودگی'' اور

اس کے تخلیقی شعور کی عکاسی ضروری ہے۔''۱۹۹۰ء کی دہائی میں ماتحت/ تابع فرمان مترجم کی بجائے ایک تخلیق کار اور ثالث مترجم کا تصور آیا جو ثقافتوں اور زبانوں میں ثالثی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔''[۲]

آندرے لیفیور اور لارنس وینوٹی نے ترجمے کو ثقافتی اور تاریخی تناظر میں اہمیت دی اور اس کی مختلف جہات کو دریافت کرنا شروع کیا۔ چنانچہ ان کے مطابق ترجمہ ایک زبان کے الفاظ کو ڈی کوڈ کر کے انھیں دوسری زبان میں دوبارہ encode کرتا ہے۔نئی لسانی تشریحات کے مطابق زبان signified اور signifiers کا ایک مربوط نظام ہے چنانچہ ترجمہ ایک زبان کے signifiers کو دوسری زبان کے signifiers سے بدلتا ہے اور مترجم ایک آزاد کار بن جاتا ہے جو متن کو اصل زبان کے متعین نشانات سے آزادی دلا کر دوسری زبان کے الفاظ کا پیکر عطا کرتے ہوئے اس خلیج کو پاٹتا ہے جو اصل مصنف اور نئی زبان کے قارئین کے درمیان اصل زبان کی صورت میں حائل ہوتی ہے۔ ترجمہ ابتدا میں grammar - method translation کی صورت میں کسی زبان کی آموزش کے لیے استعمال کیا جاتا تھا مگر اب ترجمہ زبان سے زیادہ متن میں موجود پیغام کی ترسیل پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے کیونکہ ترجمہ اقوام عالم کے مشترکہ تہذیبی و علمی سرمائے کو ایک دوسرے تک پہنچانے اور روشناس کرانے کا کام بھی سرانجام دے رہا ہے۔ترجمہ محض ادب سے تعلق رکھنے والی سرگرمی ہی نہیں بلکہ اس کا دائرہ تمام انسانی علوم اور دریافتوں تک پھیلا ہوا ہے۔علم نسل انسانی کی میراث ہے اس میراث سے ترجمے کے وسیلے سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف علمی افکار بلکہ دیگر انسانوں کے احساسات و جذبات میں بھی شریک ہوا جاتا ہے۔اس لیے کسی بھی زبان میں ترجمے کی اہمیت سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا اور اس بارے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ ترجمے کا فن اپنے عصر کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا عمل ہے۔

ترجمے کی اقسام

یوں تو ہر صنف ادب کا ترجمہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے الگ ہوگا کیونکہ صنفی تقاضوں

کے اعتبار سے ترجمے کی قسم بھی تبدیل ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو ایک ہی صنف سے تعلق رکھنے والے مختلف فن پاروں کے ترجمے کی قسم ایک دوسرے سے الگ ہو جائے گی۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اصل متن کی نوعیت کے لحاظ سے ترجمے کی تین اقسام بیان کی ہیں:[۳]

۱۔ علمی ترجمہ

۲۔ ادبی ترجمہ

۳۔ صحافتی ترجمہ

ترکیب کے لحاظ سے علمی ترجمہ، ادبی ترجمہ یا صحافتی ترجمہ کوئی مناسب تراکیب نہیں کیونکہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ بذاتِ خود ترجمے کی اصناف واقسام ہیں حالانکہ ترجمہ تو بطور عمل ایک ہی ہے۔اقسام تو متن کی ہوتی ہیں۔متن کی نوعیت اور مواد ہی اس کو ایک الگ قسم بناتا ہے، لہٰذا راقم کے نزدیک عمومی طور پر متون کی چار اقسام ہیں جو ترجمے میں تکنیک اور طریقے کے تنوع کی متقاضی ہوتی ہیں یعنی

۱۔ علمی متن کا ترجمہ

۲۔ ادبی متن کا ترجمہ

۳۔ صحافتی متن کا ترجمہ

۴۔ مذہبی متن کا ترجمہ

ان اقسام کے مفصل جائزے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض ناقدین کے نزدیک مشینی ترجمے کو بھی ترجمے کی قسم کی حیثیت حاصل ہے مگر مذکور الصدر وضاحت کے بعد مشینی ترجمہ ترجمے کی نہیں بلکہ مترجم کی قسم کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔

علمی متن کا ترجمہ

ترجمے کا مقصد علوم وفنون کی سلطنت میں وسعت اور علمی سرمائے کو تمام انسانیت تک پہنچا کے اسے مستفید کرنا ہے۔انسانی ترقی کی بنیاد علم کی اس عالمگیر شراکت پر ہے۔ترجمہ ہی

دوسری اقوام کے شعوری ارتقا اور جدید علوم وفنون تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ اردو میں علمی اور فنی تراجم میں زیادہ تر انگریزی کتب کے تراجم آتے ہیں لیکن انگریزی کے علاوہ اگر عربی اور فارسی تراجم کو بھی شامل کر لیا جائے تو اردو میں علمی وفنی تراجم کی تاریخ لگ بھگ چار سو برس بن جاتی ہے۔ علمی متن کا ترجمہ عموماً لفظی ترجمہ ہوتا ہے۔ اس میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ترجمے میں یکسانیت برقرار رہے اور جس لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ پر کیا جائے وہ پوری کتاب میں برقرار رہے تاکہ قاری کا ذہن کسی ابہام کا شکار نہ ہو۔

علمی متن کا ترجمہ عموماً metaphrase یا لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمہ ہوتا ہے جس میں دوسری زبان کے الفاظ سے کسی انسیت، لگاؤ یا اثر کے بغیر ترجمہ ہونے والی زبان میں ان کے متبادل الفاظ کی تلاش اور فراہمی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ترجمے میں ایک زبان یعنی ماخذ زبان کا وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہاں مشکل تب پیش آتی ہے جب اس زبان کی کوئی علمی و فنی اصطلاح ہدفی زبان میں ترجمہ نہ ہو رہی ہو۔ زبان کی ابتدائی سرگرمیوں میں شعروادب جب کہ ارتقائی سرگرمی اس کا سائنسی دور ہے۔ پیچیدہ اور دقیق نکتہ ہائے علم کو بلیغ اور موثر انداز میں بیان کرنا تربیت کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا ترجمہ زبان کی تربیت کر کے اسے تجربہ اور اعتماد عطا کرتا ہے۔ زبان اپنے قالب میں بڑی زبان اور اس کے افکار کو سمو کر خود اعتمادی کی منزل پا لیتی ہے، جو ترجمے کی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

علمی ترجمے کے اس لفظ بہ لفظ ترجمے کے طریقے کو نیو مارک نے ترجمے کا قبل لسانیاتی دور قرار دیا ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جو ہر دور میں بار بار ابھرتا اور سامنے آتا رہا۔ مترجمین کے لیے لامحالہ لفظ کے متبادل لفظ کی فراہمی ہی عموماً احسن طریقہ رہا ہے۔ مگر علمی ترجمے میں بھی جہاں زبان کے الجھاوے اتنے نہ ہوں بلکہ دوٹوک بیانیہ ہو بعض اوقات لفظ بہ لفظ ترجمہ کی تکنیک مجرد ترجمے میں تبدیل ہو کر اصل متن کے مطلب کو ڈھانپ لیتی ہے اور پیغام کی ترسیل موثر نہیں رہتی۔ چنانچہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کی بجائے کہیں کہیں محض خیال کی ترسیل کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ خاص طور پر علمی تراجم میں اصطلاحات کو اس طرح ترجمہ کرنا کہ ہدفی

زبان میں بھی وہ بطور اصطلاح مروج ہوسکیں، ایک مشکل اور نہایت اہم مسئلہ ہے۔ یہ کام مترجم میں کم ازکم دو صلاحیتوں کا متقاضی ہے، یعنی مضمون سے واقفیت اور وضع اصطلاحات کے لیے زبان کے صرفی ونحوی اصولوں سے آگاہی۔ چونکہ اصطلاح وضع کرنا کوئی عام یا معمولی کام نہیں بلکہ یہ خصوصی مہارت کا طلبگار عمل ہے کیونکہ بعض اوقات ایک ہی لفظ کا مفہوم شعبۂ علم تبدیل ہونے کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی لفظ کے لغت میں موجود کثیر معانی میں سے مناسب اور حسب محل معانی کا انتخاب کسی صاحب علم وفن ہی کا کام ہوسکتا ہے۔

علمی کتب عموماً منطقی انداز میں لکھی گئی ہوتی ہیں جن میں خیالات کی پیچیدگی کو اس طرح سہل بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ حقائق واضح ہو جائیں۔ عموماً کتب میں ادائے خیال ومطلب پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے جبکہ نثر کی آرائش وزیبائش اور صنعت پر توجہ عموماً نہیں دی جاتی یا مقابلتاً کم دی جاتی ہے۔ چنانچہ علمی متون کے ترجمے میں بھی خیالات وافکار کی موثر ترسیل کو اولین ترجیح حاصل ہے۔ ذاتی احساسات یا رویے اور زبان کا چٹخارا علمی کتب اور تراجم میں راہ نہیں پا سکتے۔ لہٰذا علمی کتب کے مترجم کے لیے:

"موضوع سے واقفیت بنیادی شرط ہے۔ اس کے بعد اصل زبان سے اور پھر اپنی زبان سے یہی وجہ ہے کہ ڈیٹ رائٹ (امریکہ) کی Men Translation Project میں یہ طریقہ برتا گیا ہے۔ Translator, Quality Control Technical Editor, Language Editor، مترجم، معیار کا نگران، ٹیکنیکل ایڈیٹر، زبان کا ایڈیٹر۔ اس لیے میری رائے میں ترقی اردو بورڈ کو خالص علمی کتابوں کے ترجمے میں پہلے تو موضوع کے ماہر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ترجمے کے معیار کو پرکھنے کے لیے ایک دوسرے ماہر کو کتاب دکھانا چاہیے جسے تراجم کا بھی تجربہ ہو۔ اس کے بعد ٹیکنیکل ایڈیٹر سے مدد لینا چاہیے جو صرف یہ دیکھے کہ مواد کی ترتیب، اعداد وشمار، چارٹ وغیرہ درست ہیں۔ آخر میں زبان کے ماہر کی نظر بھی ضروری ہے تاکہ ترجمہ زبان کی جی نی اس (genius) کے مطابق ہو اور الفاظ کی نشست اور جملوں کی

ساخت اجنبی نہ معلوم ہو"۔[۴]

علمی تراجم کی بھی مزید اقسام ہوتی ہیں اور ہر قسم کے مطابق ترجمے کی زبان الگ الگ ہوگی۔ مثلاً قدرتی علوم جن میں طبعی اور حیاتیاتی علوم آتے ہیں میں اصطلاحات اور حقائق کی پیشکش ہوگی اور زبان کے آہنگ اور لے سے مترجم کو کوئی غرض نہیں ہوگی۔ سماجی علوم میں تاریخ اقتصادیات، سیاسیات، لسانیات، جغرافیہ وغیرہ آتے ہیں ان میں نثر کا کام قدرے مشکل ہو جاتا ہے کہ ان مضامین میں نظریات کا تنوع اسلوب کے تنوع کا سبب بنتا ہے جبکہ انسانی علوم پر مبنی کتب کے ذیل فلسفہ، ادبیات اور فنون لطیفہ آتے ہیں۔ ان میں بھی معروضیت اور سائنٹفک طرزِ استدلال کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

ادبی متن کا ترجمہ

ادب انسانی زندگی اور معاشرے کا عکاس ہے۔ عصر حاضر میں اقوام کے باہمی میل جول کے ساتھ ساتھ ادب کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کا عمل بھی تیز تر ہو گیا ہے۔ ادب اقوام کی زندگی میں جھانکنے اور ان کے قومی شعور کی سطح کی عکاسی کا بہترین ذریعہ ہے اس لیے ادب کا ترجمہ مشینی یا غیر تخلیقی کام نہیں بلکہ یہ تو ایک قوم کے فکر و فن کو دوسروں تک یوں منتقل کرنا ہے کہ اس کی اپنی بوباس بھی حتی الوسع قائم رہے اور نئی زبان کے مزاج سے ہم آہنگی بھی مقدور بھر ہو جائے۔ ترجمہ محض ترجمانی نہیں ہے اور جہاں بات ادبی متن کی آ جائے وہاں اس عمل کی پیچیدگیاں لامحالہ نزاکت کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ادبی متن نہ محض خیال ہے نہ صرف اسلوب۔ خالق کی شخصیت کی انفرادیت اور اپنے معاشرے کے عصری شعور کی عکاسی وہ قوس قزح ہے جس میں رنگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنا وجود بھی برقرار رکھتے ہیں اور نئے رنگوں کو جنم بھی دیتے ہیں اور ہر جزو کی اپنی انفرادی اہمیت و مقام بھی ہے لہٰذا ادبی متن کا ترجمہ ایک کٹھن مگر پرلطف مشقت ہے۔

ہر عہد کے سماجی اور ادبی نمونوں میں اس عہد کے شعور اور تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی علامات و اشارات میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے چنانچہ حقیقت کی عکاسی کے لیے دوبارہ سے اس کی عکس بندی ضروری ہو جاتی ہے۔ حقیقت کی یہی عکس بندی اس فن پارے کی قدر کا تعین کرتی ہے۔ چنانچہ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ادبی تراجم ایک تہذیب یا قوم اور دوسری تہذیب وقوم کے درمیان فنکارانہ ابلاغ کی واحد صورت اور راستہ ہے۔ عظیم فن پارے دنیا کے متعلق ہمارے نظریات کی ابجد تک کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتے ہیں۔

ماخذ زبان کا مترجم قاری متن کو پڑھتا ہے تو اس کے ذہن میں متن کی تفہیم اور ترجمے کا کام بیک وقت ہو رہا ہوتا ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر وہ متن کی قفل کشائی کرتے ہوئے اسے ہدفی زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔ گویا مترجم متن کا محض قاری نہیں ہوتا، وہ اس کا شارح اور باز مصنف بھی ہوتا ہے کیونکہ زبان کے متن کو ایک سے زیادہ نظاموں کے سیٹ کی مدد سے سمجھا جا رہا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دلیل دینا غلط ہے کہ مترجم ترجمہ کرتا ہے مگر توضیح نہیں۔ ترجمے میں یہ دو عمل نہیں ہیں۔ 'بین اللسانی ترجمے میں ماخذ زبان متن کی مترجم کی اپنی تخلیقی توضیح کی عکاسی لازمی ہوتی ہے۔ مزید برآں مترجم ماخذ زبان متن کی شکل، میٹر، ترنم، آہنگ اور رجسٹر کو کس درجہ باز تخلیق کرتا ہے اسکا تعین ہدفی زبان سسٹم سے بھی اس قدر رہی ہوگا جتنا ماخذ زبان سسٹم سے۔ اسکا انحصار ترجمے کے مقصد پر بھی ہوگا'۔[۵]

ادبی متن کے تراجم کی بات ہو تو مترجم پر دوہری ذمہ داری آن پڑتی ہے۔ اسے تخلیق کار کے مطمح نظر یا خیال تک رسائی بھی حاصل کرنی ہوتی ہے نیز اس خیال کو تمام تر جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ دوسری زبان میں بھی منتقل کرنا ہوتا ہے۔ یہ فن تنی ہوئی رسی پر چلنے سے بھی کٹھن ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے کہ اس نوع کا ترجمہ بامحاورہ ہونا چاہیے اور ہدفی زبان کے روزمرہ تشبیہات، ضرب الامثال، استعارات و کنایات اور رموز و علامات سے کام لیا جائے تاکہ ترجمے میں ادبی رنگ آ جائے اور ترجمہ طبع زاد سے کم تر دکھائی نہ دے۔ ادبی ترجمے میں ادبیت کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے تراجم میں ایک زبان کا ذخیرہ ادب اور اظہار کی نت نئی

جہات دوسری زبان کو مالا مال کرتی ہیں اگر ترجمہ ان میں سے ایک کام کرتا ہے اور دوسرے کو توجہ کے قابل نہیں سمجھتا تو ترجمہ اپنا وظیفہ انجام نہیں دے رہا۔ اگر مترجم کو دوران ترجمہ اپنی زبان کی قوتِ اظہار میں کہیں کوئی کمی نظر آتی ہے یا وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی زبان دوسری زبان کے لفظیات کو متبادل لفظیات نہیں دے سکتی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ زبان کو اظہار کے متبادل ذرائع ڈھونڈنے ہوں گے اور اپنے دامن کو وسیع کرنے کے لیے اسی زبان یا کسی دوسری زبان کے لفظیات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اس سے دوہرا فائدہ حاصل ہوگا کہ ایک طرف تو زبان کی کمزوریوں کی نشاندہی ہوگی، دوسری طرف اس سے نجات کے لیے سعی کرنے کی تحریک بھی پیدا ہوگی۔ چونکہ یہ کوشش ابتدائی طور پر مایوس کن ہوگی اس لیے بددل ہوکر چھوڑ دینا مناسب نہ ہوگا کیونکہ یہی کوشش نئے آفاق تک رسائی بھی دے گی۔ ادبی تراجم کی اہمیت ہمہ جہت ہے۔خاص طور پر اردو زبان کی ترویج و ترقی میں ترجمے کا اہم کردار رہا ہے۔اسالیب کے تنوع اور طرز احساس کی جدت کے ساتھ ساتھ اصناف بھی اردو کے دامن کو وسیع کرنے کا سبب بنیں۔ چنانچہ اردو کی ادبی اصناف کے ترقی کے سفر میں موضوع، اسلوب، احساس اور ہیئت میں بھی بہتری اور جدت کی منزل ترجمے کی بدولت حاصل کی۔"یہ محض ہیئت ہی کے سطح پر تبدیلیاں نہ تھیں بلکہ مضمون کے ساتھ ادبی رویے کی تبدیلیاں بھی تھیں اور قدامت پسندی کی زنجیروں سے آزاد ہوکر نئے زمانے میں سانس لینے کا جتن بھی"۔[6]

ادبی تراجم کی اس ہمہ گیر جہت اہمیت کے ساتھ ساتھ ان کے ترجمے کے مسائل بھی گونا گوں ہیں۔ یہ مسائل مترجم کی راہ میں رکاوٹ بن کر عدم ابلاغ کا باعث بنتے ہیں ۔ترجمے کی مشکل ترین قسم ادبی متن کا ترجمہ ہے کیونکہ اس میں مصنف کی فکر ہی نہیں بلکہ اس کا اسلوب بیان اور زبان کا فنکارانہ استعمال اور چابکدستی بھی ہدفی زبان کے قاری تک پہنچانا مقصود ترجمہ ہوتا ہے۔ادبی ترجمہ مشکل کام ہے اور اسکی مشکلات اور باریکیوں سے عہدہ برآ ہونا آسان کام نہیں۔

صحافتی متن کا ترجمہ

یہ ترجمے کی تیسری قسم ہے جس میں سارا زور مفہوم کی ترسیل پر دیا جاتا ہے۔ چونکہ صحافتی ترجمے کا زیادہ تر استعمال اخبارات اور میڈیا میں ہوتا ہے لہٰذا اس میں ضروری ہے کہ مطلب واضح اور عام فہم الفاظ میں ادا کیا جائے۔ الفاظ کے الجھاوے، تخلیقی یا مرصع زبان کے بجائے سلیس بامعنی اور درست الفاظ کے استعمال پر دھیان دیا جائے۔ یعنی مفہوم کو اپنے مروجہ محاورے اور انداز میں ترجمہ کر کے جہاں مناسب سمجھا الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ پیش کر دیا۔ یعنی وہ تمام خوبیاں جو عموماً ترجمے میں پائی جانی چاہییں، موجود ہونی چاہییں یعنی سادگی، سلاست اور بامحاورہ اور واضح ترجمہ۔

صحافتی متن کے ترجمے کو آزاد ترجمہ بھی کہا جاتا ہے یعنی مفہوم کے ابلاغ اور ترسیل میں مترجم کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہ بات پہنچانے کے لیے اپنی مرضی کے الفاظ منتخب کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے اگر جملہ پیچیدہ تراکیب اور گنجلک یا مشکل الفاظ پر مشتمل ہو تو اسے طویل اور پیچیدہ الفاظ کے بجائے آسان اور سادہ الفاظ نیز چھوٹے چھوٹے عام فہم جملوں میں ادا کیا جائے۔ یعنی عموماً ترجمے کے متعلق مشہور ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے ہمیں اس زبان کے الفاظ یا لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہمیں ان الفاظ کے جامے میں چھپے ان معانی اور مفاہیم سے غرض ہوتی ہے اور ہم اسی کو برآمد کرنے اور اپنی زبان میں منتقل کرنے پر دھیان دیتے ہیں۔ یہ بات صحافتی ترجمے پر صادق آتی ہے۔ انگریزی سے اردو میں صحافتی ترجمے کی ضرورت کیوں اور کیسے پیش آتی ہے؟ صحافت میں ترجمہ کے مسائل دراصل برصغیر کے نوآبادیاتی دور کی یادگار ہیں اور انگریزی زبان کے ناجائز تسلط کی بناء پر صحافیوں کو ایک سے دوسری زبان میں معلومات کی منتقلی کرنا پڑتی ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اکثر ممالک میں خبررساں اداروں اور دیگر ذرائع اطلاعات سے خبر ملکی زبان میں ہی موصول ہوتی ہے اور ایڈیٹر کی ساری توجہ اس خبر کو لفظی و معنوی طور پر بہتر اور جامع بنانے پر صرف ہوتی ہے۔ پاکستان میں صحافت براہ راست ترجمے کا عمل اس لیے بھی بن جاتی ہے کہ خبررساں اداروں کی

خبریں،قومی اداروں کی رپورٹیں اور پریس ریلیز انگریزی میں جاری ہوتے ہیں جبکہ ملکی میڈیا کی اکثریت کا ذریعہ اظہار اردو ہے۔لہٰذا ذرائع ابلاغ کے اداروں میں ان خبروں اور رپورٹوں کا اردو ترجمہ کیا جاتا ہے۔

صورتِ حال میں خوش آئند تبدیلی یہ آئی ہے کہ ملکی سطح کی خبریں چونکہ اردو یا مقامی زبانوں میں ہوتی ہیں لہٰذا ان کو ترجمہ کر کے انگریزی زبان میں نشر کیا جاتا ہے۔صحافتی ترجمے کی راہ میں حائل مشکلات کو ڈاکٹر مسکین حجازی نے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔ے

- مرکزی نظام کا فقدان
- اسم معرفہ کی پہچان
- تاریخ اور جغرافیہ
- عربی اور فارسی کے نام بذریعہ انگریزی
- واقفیت عامہ
- لسانی مسئلہ
- تنگی وقت کا مسئلہ
- وسائل کی کمی
- تربیتی سہولتوں کا فقدان

ترجمے کے ضمن میں یہ عمومی مسائل بھی ہیں کیونکہ ادبی ترجمہ ہو یا صحافتی،ترجمے کے کسی معیار کے تعین کے لیے کوئی مرکزی ادارہ یا نظام فعال نہیں ہے۔

علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

کے مصداق جس کی سمجھ میں جو لفظ آتا ہے وہ اسی طرح ترجمہ کر دیتا ہے۔البتہ تنگی وقت وہ خصوصی مسئلہ ہے جو صحافتی متن کے ترجمے سے متعلق ہے۔خبریں آنے سے نشر ہونے تک کا

وقت مخصوص اور محدود ہوتا ہے جس میں کام تیزی اور مستعدی سے کیا جانا ہوتا ہے۔ ایڈیٹر یا سب ایڈیٹر کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ کسی لفظ کے معانی و مترادفات کے لیے لغت دیکھے یا کسی لفظ کا برمحل ترجمہ کرنے کے لیے مترادف الفاظ پر غور و فکر کرے۔ افراتفری اور ہنگامی صورتِ حال کے تقاضوں کے مطابق اس کا اپنا علم، شعور اور واقفیتِ عامہ کے ساتھ ساتھ زبان کی مہارت ہی کام آتی ہے۔ جس میں جتنی زیادہ یہ صلاحیتیں ہوں گی اتنا ہی اس کا ہنگامی ترجمہ بھی بہتر ہوگا۔ مگر دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح یہاں بھی باکمال اور صاحبِ علم و فن افراد بہتر سے بہتر مواقع کے لیے اچھی جگہوں پر چلے جاتے ہیں۔ اور درجہ دوم اور سوم کے اخبارات اور چینلز اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے کرتا دھرتا بنے رہتے ہیں۔ اخباری ترجمے میں سب سے مقدم ابلاغ رہنا چاہیے جو سادگی، سلاست اور روانی کی بدولت ممکن ہوتا ہے لہٰذا مترجم کو یہی خوبیاں پیش نظر رکھنی چاہییں کیونکہ اس کا مقصد علمیت کا اظہار یا قارئین و سامعین کو الجھن میں ڈالنا نہیں بلکہ ایسا ابلاغ ممکن بنانا ہے جس میں کوئی الجھن نہ رہ جائے۔

صحافت اب محض اخبار اور ٹی وی تک محدود شعبہ نہیں ہے بلکہ ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت اب اخبار، فلم، کیبل، ٹی وی پبلشنگ ہاؤسز، لغات، انٹرنیٹ، ماس ای میلنگ وغیرہ سب شامل ہیں اور صحافتی متن کا ترجمہ ان سب ذرائع سے متعلق ہے۔ لی ڈیفینگ کے مطابق عموماً صحافت کے میدان میں ترجمے کے تین طریقے استعمال کیئے جاتے ہیں۔[۸]

۱۔ مکمل متن کا ترجمہ

۲۔ منتخب متن کا ترجمہ

۳۔ اپنے نیوز سٹاف کی رپورٹ کا ترجمہ

صحافت کے شعبے میں سب سے زیادہ منتخب متن کے ترجمے کا طریقہ مستعمل ہے۔ صحافت اور ترجمے کا چولی دامن کا ساتھ ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ عموماً سامعین و ناظرین کا ذہن ترجمے اور صحافت کے باہمی تعلق کی طرف نہیں جاتا نہ ہی خبر سن یا پڑھ کر وہ ترجمے اور صحافت کے اس تعلق کو شناخت کرنے کے قابل ہوتے ہیں، حالانکہ صحافی مسلسل بطور

ترجمان اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہوتا ہے۔کوئی واقعہ،تقریر یا بیان ظاہر ہے کسی ایک زبان میں دیا جاتا ہے اگر اس واقعے کو علاقائی اور قومی سطح کے میڈیا یعنی پرنٹ،الیکٹرونک اور آن لائن میڈیا پر نشر کرنا مقصود ہو تب بھی اس کی رپورٹنگ زبان تبدیل ہوتی ہے ۔یہی واقعہ جب بین الاقوامی میڈیا پر رپورٹ کیا جائے تو ہر چینل یا ذریعہء ابلاغ کی زبان کے مطابق اس کو ترجمہ کیا جائے گا۔اس سلسلے میں بیان کا بعینہ ترجمہ نہیں کیا جائیگا بلکہ ہدفی زبان میں ادائے مطلب کی کوشش کی جائے گی۔یعنی صحافت میں متن کے ترجمے کے لیے ہدفی زبان کے متبادل الفاظ اہم نہیں ہیں بلکہ یہاں خیال اور مقصد اہم ہے جسے اپنی مرضی کے الفاظ اور قالب عطا کر کے محض ایک مقصد حاصل کیا جائے گا اور وہ مقصد ہے ابلاغ۔

صحافتی مقاصد کے لیے متن کے ترجمے اور طریقہ ہائے ترجمہ پر سب سے زیادہ اثر میڈیا کے بدلتے ہوئے کردار نے ڈالا ہے۔اب میڈیا کی ذمہ داری آگاہ کرنا اور ابلاغ نہیں ہے بلکہ میڈیا کسی گروپ آف انفارمیشن کی طے شدہ پالیسیوں اور نظریاتی بنیادوں پر مخصوص معلومات یا تصویر کے کسی ایک ترجیحاتی رخ کا سامعین و ناظرین تک ابلاغ ہے۔چنانچہ ابلاغ کے مقصد سے موجود متن کا انتخاب کیا جاتا ہے،متن میں موجود تمام تر معلومات کا ابلاغ نہیں کیا جاتا بلکہ ایک بات بتائی ہے اور اک بات چھپائی ہے کی طرز پر کچھ معلومات کو ارادتا چھپا کر دوسری معلومات کا ابلاغ اپنے طے شدہ الفاظ میں ممکن بنایا جاتا ہے۔چونکہ میڈیا کا کردار محض خبر کا نہیں ہے بلکہ سیاسی اداروں اور پارٹیوں کے طے شدہ اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے بھی میڈیا سب سے بہترین ہتھیار ہے لہٰذا ہر گروپ آف میڈیا چاہے وہ اخبار ہو، ٹی وی چینل یا آن لائن میڈیا،اپنی سیاسی مصلحتوں اور پالیسیوں کی بنیاد پر معلومات کو ترتیب دے گا۔ترجمہ ایک فن اور معلومات کی منتقلی کا عمل ہے مگر صحافت کے میدان میں ترجمہ ایک فعال سیاسی کردار ادا کرتا ہے۔ بین الاقوامی دوروں کے دوران تقاریر، دوطرفہ معاہدوں اور دستاویزات کا تبادلہ اور اجراء اہم سیاسی سرگرمیاں ہیں لیکن یہ تمام سیاسی اقدامات ترجمے کے دست نگر ہوتے ہیں۔حکومتیں اپنے سیاسی عزائم اور پالیسیاں اپنے لوگوں نیز دیگر ممالک تک

پہنچانے کے لیے ترجمے کا استعمال کرتی ہیں۔ ہر ادارے کی اپنی ترجمہ پالیسی ہوتی ہے۔ ترجمے کا سیاسی کردار واضح کرنے کے لیے ایک مثال یہ ہے کہ جملے کی ساختیاتی سطح پر ہلکی سی تبدیلی معانی میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ بیان یا واقعے کے تاثر کو تبدیل کر سکتی ہے۔ میڈیا کے بدلتے ہوئے کردار اور سیاسی طور پر مملکت کے پانچویں ستون کی حیثیت کے حوالے سے کرسٹینا شیفنر اور سوسن بیسنٹ لکھتی ہیں:

> دیگر ممالک کی سیاست اور سیاسی واقعات کے متعلق معلومات کی ترسیل میں میڈیا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یوں عوام پر اس کے تاثر اور ان کے ردعمل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ (اور حقیقت میں بھی) ملکی سیاست دانوں کے اقدامات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔[۹]

میڈیا کے اس کردار کی وضاحت میں اس سے قبل میڈیا کی سیاسی مصلحتوں اور پالیسیوں کا ذکر آ چکا ہے۔ دراصل انفارمیشن ٹیکنالوجی ترقی اور انٹرنیٹ نے صحافت کے پیشے کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ صحافی کے پاس کام کرنے اور کام کر دکھانے کے لیے وسیع میدان، سامعین و ناظرین کی وسیع رینج کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجیکل مدد بھی میسر ہے لہٰذا اب صحافی محض وہ نہیں ہے جو کسی اخبار میں کام کرتا ہے بلکہ صحافی وہ ہے جو کسی ادارتی بورڈ یا نیوز روم میں کام کرے اور خبر کے انتخاب، اسکی تحقیق، تحریر اور پھر ایڈیٹنگ کا فریضہ بھی انجام دے۔ مثال کے طور پر صدرِ پاکستان کا دورہ بھارت جو صدرِ پاکستان پرویز مشرف نے انتہائی کشیدہ حالات میں کیا۔ دونوں ملکوں کے مابین اہم مسائل کے حل سے قبل مفاہمتی پالیسی اور رواداری کے کلچر کے فروغ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر نوائے وقت اور جنگ یا جیو اور وقت کی خبر کے اسلوب کو دیکھا جائے تو اب تک کی گئی تمام باتوں کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ امن کی آشا کے عنوان کے تحت جیو اور جنگ نے صدرِ پاکستان کی معمولی سرگرمیوں کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا، صدر کے کھانے کی اشیاء اور ان کے مرکب اجزاء سے لے کر تاج محل میں خاتونِ اول کے ساتھ تصویر بنوانے جیسی سرگرمیوں کو بریکنگ نیوز بنا کر اور ہیڈ لائنز میں

جگہ دے کر طے شدہ مقاصد اور پالیسیوں کے پیشِ نظر ایک دوستانہ ماحول پیدا کرنے کی سعی کی۔دوسری طرف نوائے وقت کا سنجیدہ اور لیا دیا رہنے والا انداز اور خبر کا محتاط رویہ گزشتہ طرز پر برقرار رہا۔

صحافی کے چار وظائف یعنی خبر کا انتخاب، تحقیق، تحریر اور اسکی ایڈیٹنگ کا عمل سمجھنے سے صحافت میں ترجمے کے اہم کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔فرض کیجیے پاکستانی سیاست دان شیخ رشید جو اپنے 'ون لائینرز' اور مصالحے دار گفتگو کے لیے مشہور ہیں، حساس اداروں، سیاست دانوں، سیاسی پارٹیوں اور اہم ترین ملکی امور کے متعلق ان کے بے لاگ بلکہ بے باک تبصرے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔کوئی صحافی ان کا انٹرویو لے اور اس میں سے اپنی مرضی کے حصے منتخب کر کے انھیں اپنی رپورٹ میں اس طرح شامل کرے کہ براہِ راست اندازِ گفتگو کے بجائے کسی واسطے سے اور معروف انداز کو مجہول کر کے پیش کرے تو ممکن ہے شیخ رشید کے جارحانہ حملے اتنے جارحانہ محسوس نہ ہوں۔یہ تکنیک استعمال کرتے ہوئے صحافی اپنی مرضی کی خبر دیتا ہے۔آئے روز ٹی وی چینلز پر مختلف سیاست دانوں اور دیگر نمایاں افراد کا یہ عذر کہ ان کے بیان کو سیاق و سباق سے ہٹ کر پیش کیا گیا،بھی بعض اوقات ترجمے کی اسی تکنیک کا شاخسانہ ہوتی ہے۔میڈیا اپنی مرضی سے ہیرو یا ولن تخلیق کرتا ہے۔

میڈیا میں ترجمے کی اس اہمیت کے باوجود مقامِ افسوس ہے کہ صحافیوں کی باقاعدہ تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔صحافی کا کام مترجم کا ہے مگر وہ اپنے لیے مترجم کا لفظ استعمال نہ تو کرتا ہے نہ کرنا چاہتا ہے۔حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ اپنے اس وظیفے کو تسلیم کرے اور اس میدان میں انکل پچو اور ذاتی مہارت سے ہٹ کر باقاعدہ تربیت حاصل کرے۔میڈیا کے نمایندوں کے لیے محض اداروں میں طے شدہ اصول وضوابط اور نصاب ختم کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ان کے پیشے اور کام کے عملی پہلو کے پیشِ نظر فیلڈ میں تربیت دی جانا ضروری ہے۔ صحافت عمل کا میدان ہے اور بدلتے ہوئے تناظر میں کوئی صحافی اپنے آپ کو جتنا زیادہ اچھا مترجم بنائے گا، اتنا ہی اچھا صحافی مانا جائے گا۔

مذہبی ترجمہ

تراجم میں سب سے مشکل قسم مذہبی متن کا ترجمہ ہے۔ اردو میں فنِ ترجمہ کے مسائل اور مشکلات کی اہمیت کے پیش نظر جہاں فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث پر کتب کی شدید کمی ہے وہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مذہبی ترجمے کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ایک دو مضمون نگاروں نے اگر مذہبی ترجمے کا ذکر کیا بھی تو اس کی تاریخ، غرض و غایت پر چند سطور لکھ کر گویا اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ عموماً مذہبی متون کے ترجمے کو علمی ترجمے کے ذیل تصور کر کے سرسری تذکرے کے بعد ان پر بات نہیں کی جاتی۔ شاید اس کی سب سے بنیادی وجہ وہ عمومی عقیدہ ہے کہ چونکہ مذہبی کتب کا متن الہامی ہے لہٰذا خدا کا کلام ہونے کی بناء پر انسان اس کو اپنے الفاظ میں منتقل نہیں کر سکتا۔ دنیا کے بڑے الہامی مذاہب کی کتب نہ صرف ماخذ قانون ہوتی ہیں بلکہ ان کو پڑھنا بھی کارِثواب شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے ترجمے کی انفرادی حیثیت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر قرآن پاک کے ایک حرف کو پڑھنے پر دس نیکیاں عطا کرنے کا وعدہ ہے لہٰذا ترجمے کی وہ اہمیت اور ضرورت نہیں رہتی بلکہ ہر مسلمان اس کے اصل متن ہی کو پڑھنا پسند کرتا ہے۔

کلامِ الٰہی ہونے کے سبب، نیز پیغمبرِ خدا پر وحی کس صورت نازل ہونے کی بدولت متن کو جو تقدس حاصل ہوتا ہے نیز فصاحت اور بلاغت کی جس طرح پر کلامِ الٰہی ہو سکتا ہے اس کے پیشِ نظر کسی انسان کے علم اور ذہن میں یہ صلاحیت نہیں سمجھی جاتی کہ وہ اس کو کاملیت کے ساتھ ترجمہ کر سکتا ہے۔ تاہم اس ترجمے کی افادیت اپنی جگہ ہے یہی وجہ ہے کوئی مذہب ایسا نہیں جس کی کتب ترجمہ کی گئی ہوں۔

مذہبی ترجمے کی مختصر تاریخ سے قبل یہ تذکرہ ضروری ہے کہ مذہبی متون کا ترجمہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے علمی ہے مگر چونکہ ان متون کا خالق خود خالق کائنات ہے، نیز یہ احسن الکتب ہونے کی بناء پر تمام تر لسانی و ادبی خصوصیات سے مملو ہوتے ہیں۔ ان کی بلاغت اور فصاحت نیز بعض مقامات پر تمثیلی انداز کی بدولت ان کو ادبی ترجمے کے ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

مترجم کی طرف سے حذف و اضافہ کی قطعی ممانعت ہے کیونکہ یہ گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ ترجمے کی یہ مشکل مذہبی ترجمے کو ترجمے کی مشکل ترین اور علمی، ادبی اور صحافتی ترجمے سے الگ ایک مستقل قسم بنا دیتی ہے۔ لہٰذا مذہبی اہمیت کے حامل متون کے ترجمے کو اس کی اہمیت اور نزاکت کے پیشِ نظر ایک الگ سم ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ اس کے ترجمے میں درپیش مسائل کی نوعیت اور اہمیت دیگر اقسامِ ترجمہ سے بہت حد تک الگ ہوتی ہے۔

مذہبی ترجمے کی ضرورت اور اہمیت زیادہ تر تبلیغ و نشرِ مذہب کی بدولت ہے۔ عموماً تو یہ تصور رائج ہے کہ کلامِ الٰہی کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے خود اس زبان کو سمجھا جائے جس میں کلامِ الٰہی نازل ہوا ہے۔ توریت اور انجیل کے سلسلے میں تو سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا کہ ان کی اصل زبانیں ادق اور متروک ہونے کی بناء پر انھیں ترجمہ کرنا مجبوری بن گیا۔ ویدوں کے پیرو کار ایک مخصوص خطہ زمین میں ہونے کی بدولت ان کے ترجمے کی اتنی خاص ضرورت پیش نہیں آئی نیز ہندومت میں مذہب خاص طور پر خواش اور ایک خاص طبقے کی میراث سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے ترجمے کی وہ عمومی اہمیت اور ضرورت نہیں تھی۔ قرآن جو آخری الہامی کتاب ہے کے اصل متن کو اتنی اہمیت دی گئی کہ صرف حرف حرف پڑھنے یعنی تلاوت کرنے کا ثواب بھی رکھا گیا۔ لیکن چونکہ یہ مخصوص مذہبی کتاب نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے ضابطہ حیات بھی ہے یعنی اسلامی شریعت اور طرزِ زندگی کے اصول و ضوابط بھی اسی میں تحریر ہیں لہٰذا مسلمان عربی زبان سیکھتے ہیں تا کہ اس زبان میں لکھے قرآنی متن کو سمجھ سکیں۔ مسلم عقیدے کے مطابق چونکہ یہ کتاب انسانی رشد و ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے لہٰذا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ہدایت اور بہتری کے لیے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں اور عربی زبان سیکھیں۔ قرآنی زبان کے تقدس کی بناء پر اس کو نا قابلِ توجہ ہی خیال کیا جاتا رہا ہے لیکن جب بھی مسلمانوں نے اس کو ترجمہ کیا اسے عموماً تفہیم و توضیح کے مقصد کے تحت ہی ترجمہ کیا۔ کسی غیر مسلم کا قرآن کو ترجمہ کرنا نامناسب خیال کیا جاتا رہا تاہم غیر مسلموں نے بھی اس کو ترجمہ کیا ہے تو ان کا مقصد بھی علمی یا ادبی سے زیادہ مناظرہ رہا ہے۔

انجیل مقدس کے ترجمے میں مذہبی اور علمی غایت کے علاوہ سیاسی مقاصد بھی کارفرما رہے ہیں۔ انگریز جب استعماری عزائم لے کر ایشیاء و افریقہ کو نکلے تو مشتری پادری ان کے اہم کارندوں کے طور پر ان کے ہمراہ تھے۔ انجیل مقدس کے ذریعے مقامی باشندوں کو عیسائی بنا کر ان کی روحوں کو بچانے کا مقدس عمل مذہبی جنون کے علاوہ سیاسی حربہ بھی تھا۔ انجیل مقدس کے ترجمے کی اہمیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ''نیا صحیفہ'' ترجمے کے تنوع کے سبب وجود میں آیا۔ انجیل کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا رہا اور اس کی ایک وجہ نو آبادیاتی استعمار تھا۔ انگریز جہاں بھی گئے وہاں کی مقامی زبانوں میں بھی انجیل کا ترجمہ کرتے تھے چنانچہ انھی تراجم کی بناء پر بعض قومی زبانوں اور شناختوں کا وجود ممکن ہوا۔ اس کی ایک مثال جرمن زبان اور مارٹن لوتھر بطور مترجم ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی حوالے سے بھی ترجمے کی اہمیت نے عیسائی دنیا میں ترجمے کے ذریعے اخذ و کتاب کے عمل کی روایت مستحکم کر دی تھی۔

مذہبی کتب کے ترجمے کا ایک مقصد قدیم اور مروج تراجم میں وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ تبدیلی کر کے اسے جدید بنانا بھی ہے۔ چونکہ مذہبی کتب پر عموماً مذہب کے سربرآوردہ اشخاص ہی کی اجارہ داری ہوتی ہے اور کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ کتنا بھی صاحب علم کیوں نہ ہو، ترجمے یا تفسیر کی اجازت نہیں ہوتی لہٰذا اس اجارہ داری کے خلاف بغاوت کے علم بھی اکثر بلند ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بڑی بلند ہمت اور استقلال کے متقاضی اقدام ہوتے ہیں کیونکہ یہ تراجم اکثریت کی ناخوشی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ایڈیپ یکسل اور دیگر رفقائے کار کا ترجمہ قرآن ہے جس سے مثال آگے آئے گی۔

مقدس متون کے ترجمے کا ایک مقصد جو بہت کمیاب ہے وہ فن کا مظاہرہ بھی ہے۔ قرآن کے ترجمے میں اس کی مثال پاکستان کے ڈاکٹر طاہر مصطفیٰ ہیں جنھوں نے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قرآن کا غیر منقوط ترجمہ کیا۔ یہ نہ صرف مصنف بلکہ اردو زبان کی خلاقی اور مہارت کی ایک مثال ہے۔ کلامِ الٰہی کو غیر منقوط اسی طرح ترجمہ کرنا کہ نہ تو متن کے تقدس اور مقصود پر کوئی سمجھوتہ ہو اور نہ ہی زبان کے صرفی ونحوی تقاضے مجروح ہوں اور زبان ادق یا

بے معنی ہو جائے، یہ مہارت اور فن کا اعلیٰ مظاہرہ ہے جس کا تمام تر کریڈٹ ڈاکٹر طاہر مصطفیٰ کو جاتا ہے۔

ترجمے کی اس انفرادیت کے پیشِ نظر ان کی ترجمہ کردہ سورۃ الفاتحہ اور سورۃ الاخلاص درج ذیل ہیں۔[۱۰]

ترجمہ سورۃ الفاتحہ:

اس کے اسم سے، رحم والا اور لامحدود رحم والا ہے۔

ہر طرح کی حمد اللہ ہی واسطے کہ وہ مولا ہے کل عوالم کا۔ رحم والا اور کمال رحم والا ہے۔ مالک ہے عدل کے دہاڑ کا۔ ہمارا عملِ اطاع اللہ ہی کے واسطے اور اسی سے سوال ہے مدد کا۔ (اے اللہ) دکھا دے ہم کو محمود اور مسعود راہ۔ اس طرح کے لوگوں کی کہ مکرم ہوئے درِ الٰہی کے، سوائے وہ لوگ کہ گمراہ ہوئے اور رسوا ہوئے۔

اے اللہ اسی طرح ہی ہو۔

ترجمہ سورۃ اخلاص:

کہہ دو کہ اللہ احد ہے۔ اللہ ارحام کے سارے واسطوں
سے ماورا ہے۔ سوال ہی معدوم کہ اس کی کوئی اولاد ہو
کہ وہ کسی کی اولاد ہو۔ سوال ہی معدوم کہ اس کا کوئی
ہمسر ہو۔

ایسے تراجم کی مذہبی حیثیت شاید اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ ان میں سارا زور اپنے فن کے مظاہرے اور قرآنی الفاظ کے غیر منقوط متبادلات کی تلاش پر ہوتا ہے مگر پھر بھی یہ قابلِ قدر اور قابلِ تحسین کوشش ہے۔

مذہبی متون میں بنیادی الہامی یا مقدس کتب کے علاوہ متون بھی شامل ہیں۔ اس کی واضح مثال اسلام میں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کا بھی بطور مستند ذریعہ علم تصور کیا جاتا ہے۔ جتنی احتیاط قرآن کے متن کو ترجمہ کرتے ہوئے کی جائے گی کم و بیش وہی ترجمہ احادیث

میں روا رکھی جائے گی۔

چونکہ دیگر مذاہب کی کتب میں محض متن کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو اسلام میں قرآن سے وابستہ ہے۔ لہٰذا مذہبی ترجمے میں تبلیغ اور تفسیر پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اگرچہ مذہبی اہمیت کے حامل متون کے ترجمے میں درپیش مسائل علمی بھی ہیں اور ادبی بھی، لیکن ان کی ایک اپنی الگ نوعیت بھی ہے جن میں سے زیادہ تر کا اطلاق ترجمۂ قرآن پر ہوتا ہے۔ ان مسائل کا ایک مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

لغوی ترجمہ: علمی متن کے ترجمے کی طرح مذہبی متون میں اہمیت پیغام یا بات کو حاصل ہوتی ہے لہٰذا اس کی ترسیل اور ابلاغ میں خاص اہتمام روا رکھا جانا ضروری ہوتا ہے۔ عموماً ایسے تراجم لغوی ہوتے ہیں۔ یعنی لفظی ترجمہ ترجمہ ماخذ زبان کے لفظ کے لیے ہدفی زبان میں متبادل لفظ ڈھونڈا جاتا ہے تاکہ پیغام کم و بیش انھی الفاظ اور اسی اسلوب میں ہدفی زبان کے قاری تک منتقل ہو سکے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک زبان کے کسی لفظ کے لیے دوسری زبان میں محض ایک ہی لفظ موجود ہوتا ہے؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہے۔ ایک سے زیادہ الفاظ کی موجودگی میں یہ کیسے طے کیا جائے گا کہ کون سا لفظ مناسب اور موزوں متبادل ثابت ہوگا؟ ماخذ زبان کے ایک لفظ کے لیے ہدفی زبان میں موجود کئی الفاظ میں سے ہر لفظ کے ساتھ ترجمہ کیا جا سکتا ہے لہٰذا ان معانی کی موجودگی میں ہر ترجمہ درست بھی قرار پائے گا مگر چونکہ مذہبی متن محض ادب پارہ نہیں ہے کہ اس کے اس معنوی تنوع سے حظ اٹھایا جائے گا۔ لفظ کے معانی میں ذرا سے رنگ ہلکے یا گہرے ہو جانے سے بعض اوقات پورے کا پورا ترجمہ ایک نئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

چونکہ مذہبی متون میں سے اکثر کی حیثیت ایک ضابطے اور دستور کی سی ہوتی ہے لہٰذا ترجمے میں مترجم ایک مستقل بے یقینی کی کیفیت کا شکار رہتا ہے کیونکہ وہ یہ بات تسلیم کر کے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے کہ کلامِ الٰہی کو مکمل طور پر سمجھنا اور اس کی ترجمانی کا حق ادا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر کوشش انسان پر فرض ہے۔ ایل سوانسن کے مطابق "مذہبی اور

فلسفیانہ متن کے ترجمے میں دلچسپ صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ترجمہ کس حد تک درست ہے یہ تو اندازہ ہو جاتا ہے مگر یہ کس حد تک غلط ہے یہ پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ ایک لفظ کے سبھی ترجمے درست ہو سکتے ہیں اور بھی غلط یا نامکمل۔ مثال کے طور پر قرآنی آیت ''الرجال قوامون علی النساء'' کے انگریزی میں چار ترجمے پیش خدمت ہیں:[۱۲]

Yusuf Ali

Men are the protectors and maintainers of women,

Pickthal

Men are in charge of women,

Shakir

Men are the maintainers of women.

Reformist

The men are to support the women.

ایک ہی لفظ کے متبادل الفاظ جو سبھی درست ہیں مگر ان مختلف الفاظ میں سے ایک لفظ کی بناء پر ایک پورا نظامِ زندگی تبدیل ہو کر رہ سکتا ہے۔ زبان کی سماجی اور سیاسی سطح پر ہر ترجمہ اپنے سیاق وسباق یا قارئین کے طرزِ زندگی کی بدولت یا تو مکمل قبولیت کی سند پا سکتا ہے اور یا پھر قطعی طور پر رد کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآنی آیت کے ترجمے کو اگر کسی ایشیائی یا عربی ملک میں پیش کیا جائے تو پہلے تین ترجمے مسندِ قبولیت پائیں گے کیونکہ مروجہ تصورات کے مطابق عورت کو ثانوی یا ایک ملکیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جبکہ چوتھا ترجمہ یورپ یا کسی ایسے ترقی یافتہ ملک کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہوگا جہاں قانوناً عورتوں کو برابر کا درجہ حاصل ہے اور وہاں کی سماجی و معاشی زندگی میں عورت بطور فرد اپنی شناخت رکھتی ہے۔ ترجمے میں آنے والا یہ تنوع چونکہ محض لفظی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک پورے معاشرے کے بنیادی اعتقادات اور سماجی ڈھانچے پر اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا یہ ترجمہ علمی سطح تک نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک ترجمہ ہر دور اور

دوسرا متن ہی کی سطح حرفِ آخر اور نا قابلِ تبدیل ہو جائے گا۔ چنانچہ مذہبی ترجمہ بعض صورتوں میں متن ہی طرح مقدس اور مستند قرار پا جاتا ہے اور خود مترجم بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک مثال یوجین اے نیڈا نے ''تراجم کی تقدیس'' کے عنوان سے یوں دی ہے کہ قریباً ۱۴۰۰ سال تک (Latin vulgat Bible) رومن کیتھولک کے ماننے والوں کے لیے شرعی حیثیت رکھتی تھی۔[۱۳]

انگریزی بولنے والے پروٹسٹنٹ طبقے کے لیے کنگ جیمز کا ترجمہ اور برما کے پروٹسٹنٹ طبقے کے لیے ایڈونی رم جڈسن (Adoniram Judson) کا ترجمہ بائبل آئینی اور شرعی تقدس کا حامل رہا۔ بعض تراجم کو یہ پایۂ تقدیس راتوں رات حاصل ہو جاتا ہے۔ یوجین اس کی مثال کے طور پر مغربی افریقہ کے ایک مترجم کا احوال بیان کرتے ہیں جس نے اپنے علاقے کی ایک اہم زبان میں بائبل کا ترجمہ کیا۔ بعد ازاں وہ انگلستان کی کسی بڑی یونیورسٹی سے لسانیات پڑھ کر آیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کے ترجمے میں کتنی غلطیاں ہوئی تھیں چنانچہ جب اس نے اپنے ترجمے میں تبدیلیاں کرنی چاہیں تو اسے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ اس ''کلامِ الٰہی'' میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔

مذہبی متون کی عموماً قرات کی جاتی ہے۔ یعنی مذہبی علماء عوام کے سامنے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کے علاوہ دیگر مذہبی کتب خاص طور پر عوام کی پہنچ میں نہیں ہوتیں ان کے کرتا دھرتا اور شارح مذہبی عالم یا پادری وغیرہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجمے میں قرأت اور تلاوت کا پہلو ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ مذہبی کتب چونکہ زیادہ تر سنی جاتی ہیں لہٰذا یہ عموماً اعلیٰ ترین ادبی شاہکار بھی ہوتی ہیں۔ ابہام، تلخیص اور تہہ داری مذہبی متن کا خاصہ ہوتی ہے۔ یہ کوزے میں دریا کو بند کرنے کے مترادف ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس تمام خصوصیت اور شان کو ترجمے میں منتقل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ آن پڑتا ہے کہ مترجم ترجمے کی کون سی تکنیک اپنائے۔

مذہبی متون کے ترجمے میں عوماً مترجم کو تین سطحوں پر اپنی حکمتِ عملی ترتیب دینی پڑتی ہے۔

اولاً مخصوص الفاظ اور اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت اسے بے حد محتاط ہونا پڑتا ہے

کیونکہ وہ الفاظ و اصطلاحات نہ صرف ماخذ زبان میں مخصوص معانی اور اہمیت کی حامل ہوتی ہیں بلکہ اپنے اندر لسانی و تاریخی ارتقا کی کئی تہیں بھی سمیٹے ہوتی ہیں۔ اصل متن کے قاری کے لیے وہ اتنی مشکل نہیں ہوتیں کیونکہ اس کے معانی کی مختلف پرتیں قاری کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔ اس کی مثال مختلف احادیث میں قیمتی متاع کے طور پر سرخ اونٹ کا ذکر کرنا ہے۔ سرخ اونٹ کی جو اہمیت عرب کے باشندے کے لیے ہے وہ اس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں لیکن جب یہ متن غیر عرب باشندوں کے لیے ترجمہ کیا جائے گا تو حواشی لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس کے بغیر متن کا پیغام نہیں سمجھا جا سکے گا۔

ثانیاً عمومی تصورات اور خیالات کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو خیال رکھنا پڑے گا کہ خیال یا تصور ترجمے میں یوں منتقل ہو کہ قاری اس کو سمجھ سکے اور مطلوبہ تاثر بھی پیدا ہو سکے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ ایک ہی خیال کو دو زبانوں میں یکساں تاثر اور اثر کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا نیز قارئین کے سماجی و تہذیبی سیاق و سباق کے مطابق اس کی تفہیم کی سطح بھی بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر الہامی مذاہب کے پیروکاروں کے لیے لفظ "ایمان" "خالق" یا "مالک" وغیرہ سے لامحالہ ذہن ایک خدا یا اللہ کی ذات کی طرف جاتا ہے کیونکہ یہ تمام خصوصیات اسی کی ذات سے وابستہ کی جاتی ہیں لیکن دہریہ اور بت پرست یا بدھ مت کے پیروکار قارئین کا ذہن اس طرف نہیں جائے گا۔ ایسی صورت حال میں مترجم کو خیال رکھنا پڑے گا کہ وہ لغوی اور توضیحی معانی میں توازن رکھے یا حواشی میں توضیح کرے کیونکہ قارئین اور سامعین کی ضروریات اور تفہیم کی مختلف سطحوں کے فرق کو سمجھنا اور ان کے مطابق مناسب حکمت عملی اختیار کرنا مترجم کی ذمہ داری ہے۔

تیسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مذہبی اور دیگر تمام اقسام کے تراجم پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں قارئین کا بہت اہم مقام ہے۔ کیونکہ یہ وہ محرک ہے جو پبلشنگ انڈسٹری اور خود مترجمین کو ترجمے پر اکساتا ہے اور یہ محرک ترجمے کا ہدف بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلی دونوں سطحوں یعنی لفظ اور تصور دونوں کو باندھنے والی ڈور قارئین ہوتے ہیں۔ لفظوں کے معانی

اور ان کے مختلف رنگوں سے لے کر تصورات تک قارئین کی ذہنی، علمی، سماجی معاشی اور مذہبی سطح کے مطابق ترجمے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ مثلاً انجیل کا ترجمہ ایک عام مسلمان اور ایک عالم دونوں کے لیے یکساں اہمیت کا حامل نہیں ہوگا نہ دونوں پر یکساں تاثر قائم کرے گا۔ اصل قارئین کا متن کی زبان میں موجود حوالوں اور تلمیحات سے واقفیت تو مسلم ہے کیونکہ مذہبی کتب کے متن کو سمجھنے میں مشکلات دوسری زبان کے قارئین کے لیے ہیں۔ پہلے اور براہِ راست مخاطب قارئین کے لیے متن آئینے کی طرح شفاف اور واضح ہوتا ہے۔ اس کی ایک بڑی دلیل متن میں موجود کنائے اور تلمیحات ہیں۔ کنائے اور تلمیحات کی کسی کلام میں موجودگی کا محض ایک جواز ہے کہ ان کی مدد سے قاری کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے کیونکہ یہ قاری کے دائرہ علم میں سے ہی کوئی مثال دے کر چیزیں زیادہ آسان اور قابلِ فہم بنانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ متن کو فہم بناتے ہیں نیز چلمن کی آوٹ سے کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے، کی علمی تفسیر بھی بن جاتے ہیں۔ اس تلمیح کی اقسام میں مذہبی تلمیح، ادبی حوالہ، کوئی اساطیری یا تاریخی واقعہ شامل ہیں۔ چونکہ تلمیح ایک ادبی اور ثقافتی سیاق و سباق کی حامل ہوتی ہے لہٰذا ترجمے میں اس کو مختلف طریقوں سے تفہیم کی آسانی کے لیے بدل دیا جاتا ہے یا اس کو سرے سے متن سے غائب کر دیتے ہیں۔ مگر مذہبی صحیفوں خصوصاً قرآن کے ترجمے میں یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ تحریف کا مطلب کفر اور کلام الٰہی کو تبدیل کرنے کی کوشش سمجھا جائے گا۔ قرآن کریم میں تلمیحات کی ضد ایک مثالوں میں ہاروت و ماروت کا قصہ، عام الفیل کا ذکر، قصہ ابراہیم و اسمٰعیل اور سورۃ القریش شامل ہیں۔ عربوں کے لیے یہ پہلے سے معلوم واقعات اور اشارات تھے لہٰذا انھوں نے ان کے سرسری ذکر سے واقعے کے تمام تر پہلو سمجھ لیے، غیر عرب یا عجمی اقوام کی زبانوں میں ترجمے کی صورت میں مترجم حواشی میں اس کے معانی اور تفسیر و توضیح کرے گا۔

مذہبی تراجم کا فارمیٹ کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال مترجمین کو پریشان کرتا رہا ہے۔ ترجمہ چونکہ قارئین کو مدنظر رکھ کر کیا جا رہا ہوتا ہے تو انجیل کے سلسلے میں بحث بھی رہی کہ کیا اس کے

پیرا گراف بنا کر اور مختلف سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کے طور پر اس کا ترجمہ کیا جائے۔ ایسا کرنے میں قباحت یہ تھی کہ ترجمہ بادی النظر میں مذہبی کتاب کی سی تقدیس کے بجائے کوئی ادب پارہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ مذہبی صحیفوں کی زبان کو روزمرہ زبان میں عام فہم اور سہل انداز میں ترجمہ کرنا اگرچہ تفہیم اور تبلیغ کو آسان بنا دیتا ہے مگر مذہبی صحیفوں کے معاملے میں اخباری زبان کو وہ لوگ بھی عموماً ناپسند کرتے ہیں جو اپنی روزمرہ زندگی میں اس زبان کے حامی ہیں۔ خود قرآن حکیم چونکہ لسانی اور بیانیہ اعتبار سے عربی زبان کا ایک شاہکار ہے اور عربوں نے قرآنی زبان کے سامنے عجزِ بیان کا اظہار کیا اور ''ماہذا کلام البشر'' کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا لہٰذا اس کے ترجمے میں بھی زبان و بیان کی وہ تمام خوبیاں مدنظر رکھنی چاہیں جو اس کے شایان شان ہوں۔

ترجمہ قرآن کے فارمیٹ کے سلسلے میں جیسا کہ ذکر ہو چکا کہ متن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے لہٰذا اس کو ترجمے کے ساتھ ہی لکھا جانا ضروری ہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۶ء کے عرصے میں مصر میں قرآنی ترجمے کا فارمیٹ زیرِ بحث رہا کیونکہ کمال اتاترک نے روشن خیالی کے عرب اور عربی سے نجات کے لیے قرآن کو ترکی زبان میں اس طرح ترجمہ کرنا چاہا کہ محض ترکی ترجمہ شائع کیا جائے اور عربی متن کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ ۱۹۳۶ء میں جامعہ ازہر نے قرآن کے ترجمے کے فارمیٹ پر فتویٰ دیا جس کی رو سے ترجمہ کے ساتھ متن کی اشاعت ناگزیر قرار دی گئی نیز قرآن کی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی ترجمہ کرنے کو مناسب قرار دیا گیا۔ لائیتھ صالح الشیبان (Layth Saleh Al-Shajban) البتہ ایڈپ یکسل (Edip Yuksel) اور مارتھا شلٹے نافع (Martha Schulte Nafeh) کے Qura; A Reformist Translation کا فارمیٹ اس فتوے کا قطعی برعکس ہے۔ یہ قرآنی سورتوں کی ترتیب توقیفی کے مطابق ہی ترجمہ شدہ ہے مگر اس انگریزی ترجمے میں عربی متن شامل نہیں کیا گیا اور آیات کا ترجمہ نمبروار کیا گیا ہے۔ نیز صفحے پر دو کالم بنا کر ان میں ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کی ایک اور خصوصیت آیات کو ایک عنوان یا سرخی دینا ہے۔ گویا نئے موضوع پر آیات سے قبل وہ

موضوع Italic میں لکھ کر نمایاں کر دیا گیا ہے۔

یوجین اے نیڈا نے متن کے ساتھ بطور ضمیمہ جات بہت کچھ شامل کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے۔ (۱۴) ریفارمسٹ ترجمہ قرآن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ضمیمہ جات اور وضاحتوں کی شکل میں مترجمین کا تعارف، چند بنیادی اصطلاحات کا مطلب، مترجمین کی خصوصی توجہ کا مرکز چند اختلافی نکات اور قرآن پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش بھی ترجمے کے ساتھ شاملِ کتاب ہیں۔ مذہبی علماء کے نقطہ نظر اور فتاویٰ سے قطع نظر اگر اس کوشش کو محض ادبی سطح پر اور بطور مترجم پیشہ ورانہ ذمہ داری کے طور پر دیکھا جائے تو یہ قابلِ تحسین ہے۔ راقمہ نے ذاتی مشاہدے اور دائرہ علم میں اس طرح کی ایک اور کوشش ہے جسے راقمہ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ایک احسن کوشش قرار دیا ہے۔ اگر چہ وہ مثال ایک ادبی فن پارے کی ہے یعنی روسی زبان میں لیو ٹالسٹائی کا ناول ''جنگ اور امن'' جسے شاہد حمید نے ترجمہ کیا۔ مترجم نے مصنف کا تعارف، اپنے منتخب متن کا تعارف اور وجوہات، اہم کرداروں کے نام اور تلفظ، اہم الفاظ اور اصطلاحات کا ترجمہ وغیرہ شامل کیا کیونکہ ناول نہ صرف اجنبی زبان بلکہ بالکل برعکس ثقافت کا آئینہ دار تھا لہٰذا ان وضاحتوں کے بغیر تفہیم ممکن نہیں تھی یوں ترجمے کا مقصد پورا نہ ہو پاتا۔

مذکورالصدر ترجمۂ قرآن میں بھی چونکہ مترجمین محض ترجمہ قرآن نہیں بلکہ ایک ''اصلاحی'' ترجمہ قرآن پیش کر رہے تھے لہٰذا ان تمام ضمیمہ جات کا ہمراہ ہونا ضروری تھا۔ مذہبی بحث اور اختلافی مسائل سے ہٹ کر متن کی تفہیم میں یہ سعی قابلِ قدر ہے۔ کیونکہ یہ بات اسی مضمون میں پہلے مذکور ہے کہ ترجمہ لفظی ہو تب بھی ایک لفظ کے کئی معانی ہو سکتے ہیں اور ہر ترجمہ جزوی طور پر یا کلی طور پر درست بھی ہوتا ہے اور غلط بھی۔ ترجمے میں ابلاغ کی یہ کوشش ترجمے کے عمل میں خوبصورتی ہے کیونکہ ترجمے میں اور خصوصاً مذہبی کتب کے ترجمے میں تکمیلیت محض ایک خواب ہے اور مترجم اپنی جدوجہد کا آغاز ہی اس سوچ سے کرتا ہے کہ وہ مکمل تفہیم یا مکمل ابلاغ نہیں کر پائے گا۔ لہٰذا مقدس کتب کی قدامت کو باوجود بہت سے اہم مذہبی متون عدم

تفہیم کا شکار رہتے ہیں۔ کئی مشکل الفاظ، تراکیب اور خیالات وضاحت کے طلبگار رہتے ہیں۔ یہ خزینے مدفون پڑے اپنے دریافت کیے جانے کے منتظر رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال حروف مقطعات ہیں۔ لہٰذا مذہبی تراجم ضروری ہیں چاہیے ان کی اجازت ہو یا نہیں کیونکہ یہ ضروری بھی ہیں اور مشکل بھی۔ مذہبی ترجمے سے سب کبھی خوش نہیں ہوں گے۔

ڈاکٹر مارک سٹراس نے اپنے مضمون "Four Key Principles of exegesis" (۱۵) میں مذہبی متون کے ترجمے کے چار بنیادی اصول پر روشنی ڈالی ہے۔ موضوع کی مناسبت اور مطابقت کی بنیاد پر ضروری ہے کہ ان کے مضمون کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے۔ exegesis سے مراد متن میں مصنف کے مقصود معانی کو سمجھنا ہے۔ ترجمہ ایک پل ہے جو مصنف اور قاری کے زمانے اور زبان کے درمیان تفہیم آسان کرتا ہے یعنی کسی بھی عہد کا قاری/ مترجم متن میں مصنف کے مقصود معانی کو اپنی زبان اور ثقافت کی مدد سے سمجھتا ہے۔ چونکہ مذہبی متون میں اکثریت صدیوں سے موجود ہیں اور آئندہ آنے والی صدیوں تک ان کے رہنے کے امکانات یا بشارتیں بھی ہیں لہٰذا ہر دور کے قاری اور اصل مصنف یعنی خود خدا کے مقصود معانی کے درمیان خلیج حائل رہے گی۔ ترجمہ اسی خلیج کو پاٹنے کا عمل ہے۔ ڈاکٹر مارک سٹراس نے اس خلا کو پر کرنے اور خلیج پاٹنے کے چار اصول بیان کیے ہیں۔

۱۔ سٹراس کے پہلے اصول کے مطابق مصنف کا مقصود معنی ایک ہے اور بطور قارئین ہم نے اسی کو دریافت کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ ترجمے کے محرکات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ہر مترجم ایک ہی مقصد کے لیے مذہبی متن کا ترجمہ کر رہا ہو لہٰذا ان محرکات کے زیرِ اثر پہلے سے سوچے سمجھے اور طے شدہ معانی متن پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ ا۔گویا ''ہمارا ہدف اصل مصنف کو اصل مصنف کے اصل سیاق و سباق میں سننا اور وہاں سے متن کے معانی طے کرنا ہے۔'' جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ہر لفظ کے لیے متبادل زبان میں کئی الفاظ ہوتے ہیں لیکن ان کے معانی میں بہت معمولی سا اختلاف ہوتا ہے اور بعض اوقات مثبت

یا منفی انداز میں مستعمل ہوتے ہیں۔ یہ مترجم کا کام ہے کہ وہ معانی کی اس نازک اور دقیق تفریق کو اپنے سامنے رکھے اور سیاق و سباق کے مطابق مصنف کے مقصود معانی کو ترجمے میں تحریر کرے۔

۲۔ ڈاکٹر سٹراس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ متن کے معانی اس کی ''صنف'' (genre) پر منحصر ہیں۔ مثلاً جو بھی ادبی صورت متن میں اختیار کی گئی ہو ترجمہ اس کے مطابق کیا جائے گا۔ چونکہ کلامِ ربانی زبان و بیان کی اعلیٰ خوبیوں سے متصف ہوتے ہیں اور انسانوں کے لیے تفہیم سہل کرنے کی خاطر اس میں مختلف ادبی ذرائع اظہار اور تکنیک استعمال کی گئی ہوتی ہیں مثلاً مناجات ضرب الامثال، حکایتیں، خطوط، قانونی مواد یا آئین، پیشن گوئیاں، تاریخ اور تاریخی بیانیے، ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو ایک ذہن اور خلاق قاری کی طرح متن اور اس میں موجود تمام فنی حربوں کی شناخت کرنی چاہیے۔ ان کا متن کی مجموعی ساخت اور مفہوم کی تفہیم میں مقام و وظیفہ متعین کرے تا کہ ترجمہ کرتے ہوئے وہ ایک ایک فنی تکنیک کی اہمیت سے واقف ہو اور اسے ترجمے میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ کیونکہ دراصل متن میں اختیار کردہ ہر فنی حربہ اور ذریعہ اظہار ایک اکائی ہوتا ہے مگر وہ اس کل کو مکمل کرتا ہے جو پورے متن کی ساخت میں شامل ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا اصول یہ کہتا ہے کہ ترجمے کی کنجی اس کے سیاق و سباق میں ہے۔ یہ اصول دراصل پہلے دونوں اصولوں کا مجموعہ ہے۔ متن کے دو سیاق و سباق ہوتے ہیں، تاریخی اور ادبی۔ تاریخی سیاق و سباق میں تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور ثقافتی گویا براہِ راست مخاطب قارئین کی پوری زندگی کے تار و پود شامل ہیں۔ ادبی سیاق و سباق کو بعض اوقات ''معاون متن'' بھی کہتے ہیں۔ یہ اصل متن کے گرد گرد پایا جانے والا متن ہے۔ یعنی وہ ذریعہ اظہار جسے تاریخی حوالے کو سمجھانے کے لیے اختیار کیا گیا۔ لہٰذا متن میں ایک لفظ کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ لفظ متن کی بنیادی اکائی ہوتا ہے جو

جملوں کی تشکیل کرتا ہے یہ جملے پیراگراف بناتے ہیں۔ لہٰذا ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ قیمتی اور قابل توجہ ہے۔ عربی سے ترجمہ کرنے کی صورت میں تو ایک ایک حرکت یعنی زیر زبر پیش تک کا خیال رکھنا ضروری ہے بصورتِ دیگر معنی میں زمانے اور جنس کی تبدیلی تک آ سکتی ہے۔

۴۔ مذہبی متون کے ترجمے میں مصنف کے مقصود معانی تک پہنچنے کے لیے ڈاکٹر سٹراس کا چوتھا اور آخری اصول یہ ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے محض متن کو اہمیت دی جانی چاہیے۔ متن اپنی ذات کے اندر ایک مکمل دستاویز ہوتا ہے۔ اس کے ترجمے میں کسی بیرونی دستاویز یا تحریر کو شامل نہیں کرنا چاہیے نہ ہی اس سے دلیل لینی چاہیے۔

مترجم یا قاری مذہبی متن کی عمودی تفہیم کرتا ہے یا افقی؟ دراصل یہ مرغولے دار تفہیم ہوتی ہے۔ کیونکہ متن کو سمجھنے کے لیے ہم اپنے نقطۂ نظر، اپنی دنیا، اپنے تعصّبات، اور ثقافتی سیاق و سباق کی مدد لیتے ہیں مگر ہم ان تمام عوامل کی بنیاد پر بننے والے معانی کی مدد سے متن کو نہیں سمجھتے نہ ہی متن میں اپنے معانی ڈھونڈتے ہیں۔ دراصل متن کے معانی کو ہم اپنی دنیا کے مطابق سمجھتے ہیں۔ یوں یہ ایک مرغولے کی شکل کا عمل ہوتا ہے۔

مختصراً یہ کہ مذہبی متون کے ترجمے کو ایک مشکل عمل قرار دیتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تفسیر و توضیح کے بغیر ان کو ترجمہ کرنا محض ایک خواب ہے کیونکہ ان میں ہر چیز قابلِ ترجمہ نہیں ہوتی۔ یعنی مترجم میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ متن کے مدعا و منتہا کو مکمل طور پر یں منتقل کر سکے۔ اس مضمون میں کی گئی تمام بحث کی روشنی میں مذہبی ترجمے کے عمل کو ایک ڈایا گرام کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ڈایا گرام پیٹر یشیا لن ولکنڈورف (Patricia Lynn Wilkendorf) نے اپنے مقالے "Training Manual in Exegetical Principals" میں دیا ہے۔(۱۶)

ڈایاگرام

Reality, Truth
The way God sees it.
(not the whole, but the part we are able to know, Job 26:14)
Very fuzzy boundary
My truth
Your truth
Trans-cultural
My Beliefs
Or
Mono-cultural Beliefs
Culture #1
Trans-Cultural
Beliefs
Your Beliefs
Or
Mono-cultural Beliefs
Culture #2
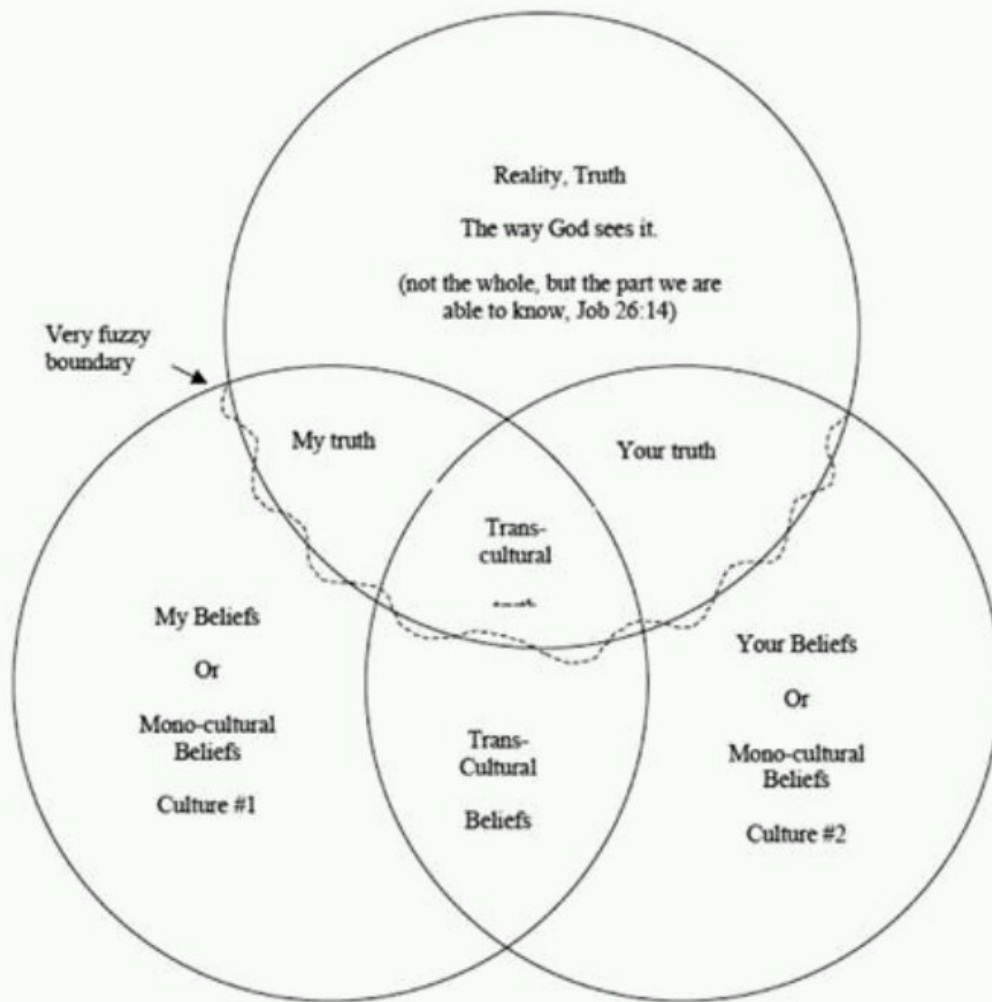
گویا مذہبی متن ایک مکمل سچ ہے جس کو ہم میں سے ہر کوئی اپنی اپنی ثقافتی اور عقائد کی وابستگیوں کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجتاً ہر ایک کے حصے میں سچ آتا ہے مگر مکمل سچ کی تفہیم اتنا آسان کام نہیں ہے۔ انسانوں کو اپنی یہ کوشش جاری رکھنی ہوگی کیونکہ سچ کی مکمل تفہیم اور تشیر ہی الہامی متون کا مقصد ہے اس سلسلے میں کوئی بھی رکاوٹ کھڑی کرنا تمام بنی نوعِ انسان کے ساتھ ظلم کے مترادف ہوگا۔

مشینی ترجمہ

انسان کی زندگی کو سہل بنانے میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے مرکزی کردار ادا کیا ہے اور انسانی مشقت کو کم یا ختم کر دیا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ انسان کی ذہنی مشقت کو سہل بنانے یا کم کرنے کے لیے مددگار ٹیکنالوجی نہ وجود میں آتی۔ کیلکولیٹر سے لے کر کمپیوٹر تک انسان کی ذہنی مشقت کو کم کرنے اور آسان بنانے کے لیے موجود ہیں۔ ترجمے کے ذیل میں بھی اگرچہ کمپیوٹر کی آمد سے قبل بھی مشینی ترجمے کا تصور موجود تھا اور ۱۹۳۳ء سے ترجمہ مشین پیٹنٹ ہو چکی تھی مگر کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد مشینی ترجمے کے میدان میں بھی زبردست تبدیلی آئی اور صورت حال اتنی بہتر ہوگئی ہے کہ مختلف کمپنیوں نے ذاتی کمپیوٹروں کے سافٹ وئیرز بنانے شروع کر دیے اور ترجمہ کی سہولت اب انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہونے لگ گئی ہے۔

ایک الجھن یہ ہے کہ مشینی ترجمہ ترجمے کی اقسام میں سے ہے یا طریقوں میں سے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہ یہ ترجمے کی قسم ہے نہ طریقہ۔ یہ تو مترجم کی ایک نئی صورت ہے۔ لہٰذا اس پر الگ سے بات کرنا ہی مناسب ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا مشینی ترجمہ اپنے معیار اور فن کے حوالے سے اتنا معتبر ہے کہ وہ انسانی دماغ اور کاوش کی جگہ لے سکتا ہے؟ یہ سوال دلچسپ ہے۔ ترجمے کو اگر محض نقالی اور الفاظ کی الفاظ سے تبدیلی قرار دیا جائے تو یقیناً کمپیوٹر انسانی دماغ سے زیادہ قطعیت کے ساتھ نقلِ معانی کر سکتا ہے۔ علمی ترجمہ مشین کے لیے آسان ہے کیونکہ الفاظ کے متبادل الفاظ اور

ان کے نحوی وصرفی قواعد کے مطابق جملہ ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ مشینی ترجمے سے شاید سب سے زیادہ فائدہ صحافتی ترجمے ہی کو پہنچا ہے کہ خبر یا بیان کو ترجمہ کر کے فی الفور پیش کیا جا سکتا ہے اگر چہ اس میں بھی سو فیصدی کامیابی کے امکانات نہیں ہیں لیکن جہاں تک ادبی ترجمے کا تعلق ہے مشینی ترجمہ مددگار نہیں ہے۔ کمپیوٹر مشین ہے اور محض Feed کئے گئے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہے۔ تخلیقی اپج کو سمجھنے کے لیے تخلیقی یا کم از کم خودکار ذہن کی ضرورت ہے جہاں تک انسانی ذہن کی تخلیقی جست کا تعلق ہے تاریخ انسانی اور ترقی گواہ ہے کہ انسان کی طبع رسا نے کوئی میدان خالی نہیں چھوڑا۔ کوئی کمپیوٹر اس خیال کو تو بیان کر سکتا ہے جو لفظوں کی ایک مخصوص ترتیب کے نتیجے میں ظہور میں آیا مگر وہ الفاظ کی تہہ داریوں میں چھپے ان رموز کو کیسے بے نقاب کر پائے گا اور یہ کیسے بتا سکے گا کہ کسی شعر میں window کو کھڑکی لکھا جائے تو تاثر بڑھے گا یا دریچہ کہنے سے بات بنے گی۔

ادب جس کا حسن خیال کے ساتھ ساتھ زبان کے استعمال میں مہارت اور مشاقی سے ہے، مشینی یا میکانیت کا متضاد ہے۔ تخلیق کا مشینی یا میکانی ترجمہ کیسے ممکن ہے؟ اقبال نے تو سائنسی ترقی کے ایک منفی پہلو کو بیان کرنے کے لیے شعر کہا تھا اور مشینوں کی حکومت کو دل کے لیے موت قرار دیا کیونکہ

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

ادبی متن خواہ انگریزی سے اردو میں ہو خواہ اردو سے انگریزی میں، یا کسی بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے، مشین اس میں چھپے احساسِ مروت اور احساس محبت کی اس نزاکت کو ترجمہ نہیں کر پائے گی جو ادب کا حسن ہے اور اسے ذہن انسانی کے دیگر افعال سے اعلیٰ مرتبہ عطا کرتی ہے۔ مشینی ترجمہ ترجمے میں کمپیوٹر کے استعمال کا عمل ہے، گویا یہ ایک مشینی اور آٹومیٹک عمل ہے جو ایک فیڈ کئے گئے متبادلات کی فراہمی تک محدود ہے۔ یہ طریقِ ترجمہ زبان کی ابتدائی آموزش کی سطح پر تو بہترین ہے لیکن ادب یا کوئی بھی کتاب ابتدائی قاعدہ نہیں کہ چند لسانی متبادلات کی فراہمی کے بعد دوسری زبان میں منتقل ہو

جاے۔دنیا گلوبل گائوں بن چکی ہے ،انٹرنیٹ نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔اب ایک کونے سے دوسرے کونے ،ایک منطقے سے دوسرے منطقے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں لوگ رابطے کے لئے ترجمے کے محتاج ہیں۔آن لائن دستیاب ترجمے کے سافٹ ویئر ان فاصلوں کو ختم کر کے انسانوں کو باہم قریب لا سکتے ہیں۔تاہم ادب محض ابلاغ یا اظہار کا وسیلہ نہیں ،یہ انسانی دل و دماغ کے افکار و احساسات کو ہر ممکن حد تک بہترین اسلوب اور لسانی مہارت کے اظہار کا ایسا پیچیدہ عمل ہے جسکی تفہیم کو راست انداز میں سمجھنا ممکن نہیں۔ایسے پیچیدہ عمل کو آٹو میٹک انداز سے سمجھنا یا سمجھانا ممکن نہیں۔چونکہ ادب اپنی نوعیت کے لحاظ سے آٹو میٹک نہیں لہٰذا اسکو مشینی انداز سے ترجمہ کرنا بھی ممکن نہیں۔کمپیوٹر یا کوئی بھی ایسا مددگار آلہ ،لغت اور دیگر معاونات جو الفاظ کے متبادلات کی فراہمی کر کے مترجم کا کام آسان اور اس کے وقت کی بچت کرتے ہیں،مترجم یا ترجمے کی قسم نہیں کہلا سکتے۔کوئی بھی مشین سرِ دست تو انسانی دماغ کا متبادل نہیں ہے،البتہ اگر ترقی کے عروج پر جا کر ایسا کچھ ممکن ہو سکے تو اسکا کوئی جواب فی الحال نہیں دیا جا سکتا۔

حوالہ جات

۱۔مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر،مغرب سے نثری تراجم،مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۸ء. ص ۱۴

2.Bassnet, Susan "Translation Studies" 3rd edition, Routledge London 2002 p.9

۳۔مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر،محولہ بالا،ص ۴۳

۴۔آلِ احمد سرور،تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل،مشمولہ ترجمہ روایت اور فن،مرتبہ نثار احمد قریشی،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،ص ۱۶۵

5. Bassnet,S, Translation Studies,p.83

۶۔مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر،اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ،مشمولہ رودادِ سیمینار اردو زبان میں ترجمے کے مسائل،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۸ء ص ۸۰

۷۔مسکین حجازی،ڈاکٹر،صحافت میں ترجمے کے مسائل اور مشکلات،مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل،مرتبہ اعجاز راہی،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۶ء،ص ۴۵

8. Li ,Defeng,"Translators as well as Thinkers:Teaching of Journalistic Translation in Honk Kong"p.612, http://id.erudit.org

9. Schaffner Christina,Sussan Bassnet, Introduction,"Political Discourse ,Media and Translation" Cambridge Scholars Publishing,Newcastle,2010 p21

10. www.zemtv.com?2013?07?12?hasb-e-haal

(راقمہ کو یہ ترجمہ کتابی شکل میں دستیاب نہیں ہو سکا لہٰذا ٹی وی پروگرام کا حوالہ دیا گیا ہے)

11.Swanson,PL,"What. is going on here?Chih-i's use(and abuse) of Scripture" Journal of the International Association of Buddist Studies,1997,p 1-30

12. Edip Yuksel,Layth Saleh Al-shaiban, Martha Schulte Nafeh," Quran:A Reformist Translation" p 17, www.progressivemuslims.org

13. Nida Eugene.A "The Sociolinguistics of Translating Canonical Religious Texts" p.195, http//:id.erudit.org

14. Nida Eugene A p196

15.Strauss Mark,Dr," Four Key Principals of Exegesis " biblicaltraining.org/library

16 . Strauss Mark ,Dr

17.Wilkendrorf,Lynn Petricial," Training Manual in Exegetical Principals" p19,books.google.com

باب دوم

ترجمے کے طریقے

○

انگریزی شاعر اور مترجم جان ڈرائیڈن نے ترجمے کو تین طریقوں میں تقسیم کر دیا۔(۱۶۸۰ء)

۱) Meta phrase یعنی لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمہ جو لغوی ترجمہ کہلاتا ہے۔

۲) Paraphrase یعنی مصنف کے خیالات کی تو پابندی کی جائے مگر اس کے الفاظ کی پابندی ضروری نہیں۔ پیرا فریز دراصل خیال یا فکر کی ترسیل کا طریقہ ہے جس میں مصنف کے الفاظ، محاورات اور جملے کی ساخت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

۳) Imitatian اس کو اردو میں معتدل ترجمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں مصنف کے الفاظ اور خیالات دونوں کو ذہن میں رکھا جاتا ہے۔ مصنف ایک زبان کے محاورے اور اجزائے کلام کو دوسری زبان میں دستیاب اس کے متبادل سے تبدیل کر دیتا ہے۔ مترجم کی تخلیقی صلاحیت ایسے ترجمے میں اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اور یہ خلاقی اس طرح ظاہر نہیں ہوتی کہ ترجمہ اصل تصنیف سے دور جا پڑے بلکہ اصل مصنف کا آہنگ

اور اسلوب سامنے رکھا جانا چاہیے۔ اردو زبان میں ترجمے کے سلسلے میں ہمیشہ سے مندرجہ ذیل خوبیاں پیش نظر رہی ہیں:

- ترجمہ صحیح ہونا چاہیے۔
- حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے۔
- سبک اور خوبصورت ہونا چاہیے۔

جتنا مغالطہ اس شرط کہ حتیٰ الامکان عام فہم ہونا چاہیے، نے پھیلایا ہے وہ ترجمے کی اہمیت اور مقام گھٹانے کی وجہ ہے۔ کیونکہ ترجمے کا صحیح ہونا اس کے عام فہم ہونے کے مترادف نہیں ہے۔ تجریدیت کے دبستان سے متعلق مصنفین کی تحریروں کا حسن یا جوہر ان کا عام فہم نہ ہونا ہے ان کے تراجم میں اگر یہی شرائط سامنے رکھی جائیں گی تو ترجمے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اگر ایک مصنف کے خیالات و افکار میں ابہام ہے اور مترجم اس ابہام کو دور کر کے اسے عام فہم بنا دیتا ہے تو اس نے خیالات کی تصحیح تو کر دی ہے مگر مصنف سے وفاداری اور سچائی نہیں نبھائی بلکہ اس کی ترجمانی کے منصب سے ہی دستبردار ہو گیا ہے۔ ترجمے کی یہ خوبی کہ وہ عام فہم اور سبک ہو یا اس میں روانی ہو دراصل اس کی خامی ہے کیونکہ ادبی چیزوں کے ترجمے میں اصل مصنف کی عکاسی اسلوبیاتی اور معنوی سطحوں پر ضروری ہے۔ اس کے الفاظ، فقروں کی بناوٹ اور بیان کی روح ہر چیز کا منعکس ہونا ضروری ہے۔ معتدل ترجمہ نہ تو لفظی ترجمہ ہوتا ہے نہ ہی آزاد، بلکہ ان کے بین بین معتدل راستے کا اختیار کرنا ہی تخلیقی شان رکھتا ہے۔ اس میں فنکار نہ تو اصل زبان کے الجھاؤں اور ہو بہو نقل کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے نہ محض خیال کی ترسیل پر اکتفا کرتا ہے بلکہ وہ اپنی زبان کو بھی کھنگالتا ہے اور دوسری زبان کے پیرائیہ ہائے اظہار کی چاشنی و ندرت کو بھی منتقل کر کے اپنے ادبی ذوق کی تربیت کرتا ہے۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ ترجمے کی ہر ہر سطر تخلیقی ترجمہ ہو کیونکہ ممکن ہے کہ اصل مصنف کے بعض جملے اور اقتباسات بیانیہ نثر کا نمونہ ہوں تو دیگر اقتباسات یا جملے شاعرانہ انداز کے حامل ہوں۔ کہیں روزمرہ ہو گا تو کہیں محاورہ اس لیے ہر سطر کے ترجمے میں یہ خیال رکھنا ضروری ہو گا کہ ترجمہ لفظی ہو گا، با محاورہ یا

آزاد۔ اس فیصلے کے ضمن میں مترجم کی فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی تنقیدی حس کا موجود ہونا بھی ضروری ہے تا کہ وہ حسبِ حال ترجمہ کر سکے۔

(vinay) ونے اور ڈاربلنٹ (Darbelnet) نے انگریزی اور فرانسیسی کے اسلوبیاتی تجزیے کے بعد اپنا ماڈل پیش کر کے ترجمے کے محض دو طریقے مقرر کیے۔[1]

۱۔ Direct Translation

اور

۲۔ Oblique Translation

راست ترجمہ دراصل لغوی ترجمے کا متبادل ہے جبکہ oblique ترجمہ آزاد ترجمے کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ترجمے کی سات حکمت عملیاں ہیں جو ان دو طریقوں کے ذیل میں آتی ہیں پہلی تین حکمت عملیاں یعنی مستعار لینا، calque اور لغوی ترجمہ، ڈائریکٹ ترجمے کے ذیل میں بیان کی جاسکتی ہیں۔

i۔ Borrowing / مستعار لینا

الفاظ کو ماخذ زبان سے براہِ راست ہدفی زبان میں منتقل کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو ہدفی زبان میں موجود معنویاتی سطح کے خلا کو پر کرنے کے لیے ماخذ زبان سے لیے جاتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی۔ بعض اوقات الفاظ اس لیے بھی مستعار لیے جاتے ہیں کہ ان کی مدد سے ترجمے میں مقامی رنگ شامل ہو سکے۔

ii۔ Calque

الفاظ مستعار لینے کی ایک خاص قسم ہے جس میں ماخذ زبان کا اظہار یا ساخت لفظی ترجمے میں منتقل کر دی جاتی ہے۔ یہ عموماً ترجمہ کرنے والی زبان میں یوں شامل ہو جاتے ہیں کہ اسی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات الفاظ کی اس منتقلی میں ان کے معانی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو میں فارسی سے مستعار چند الفاظ درج ہیں جو صوری و صوتی اعتبار سے تو ایک جیسے ہیں مگر معنوی طور پر اردو اور فارسی دونوں میں الگ الگ ہیں۔

الفاظ	معنی اردو	معنی فارسی
امیر	دولت مند	حاکم فرمانروا
پریشان	اضطراب	بکھرا ہوا
بزرگ	بوڑھا	بڑا
آب	چمک	مائع بے رنگ
احاطہ	جگہ	محاصرہ
برداشت	صبر و تحمل	اٹھانا
بندگی	عاجزی/ غلامی	عبادت
تار	ٹیلی فون وغیرہ کا تار	تانا/ تار و پود
تماشا	کرتب	دیکھنا
تواضع	خاطر مدارت	انکساری/فروتنی
حرکت	عادت/ حماقت/حرکت	جنبش
دقت	مشکل	باریک بینی
دنبہ	حیوان	جانور کا چربی والا حصہ
رشتہ	تعلق	سویاں
رقم	پیسے	تحریر کرنا
زردہ	چاول/ برنجِ شیریں	انڈے کی زردی
روزگار	نوکری۔زمانہ	زمانہ/گیتی
رائیگاں	ضائع ہونا	مفت
غصہ	طیش/قہر	غم واندوہ
نشانی	علامت/ یادگار	پتہ
مکان	گھر	جگہ

iii- لغوی ترجمہ

یہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہوتا ہے اور عموماً ایک مزاج اور لسانی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانوں میں مروج ہوتا ہے۔ مترجمین اچھے ترجمے کے لیے یہی راہ تجویز کرتے ہیں۔ لغوی ترجمہ صرف اسی صورت میں نہیں کیا جانا چاہیے جب ساختیاتی اور مابعد لسانیاتی تقاضے اس کی راہ میں رکاوٹ بنیں مگر اس صورت میں بھی معانی قربان کیے جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مترجم لغوی ترجمہ صرف اسی صورت میں نا قابلِ قبول قرار دے سکتا ہے جب لغوی ترجمہ

(i) معانی تبدیل کر دے۔

(ii) بے معنی ہو جائے۔

(iii) ساختیاتی وجوہ کی بنا پر ناممکن ہو جائے۔

(iv) ہدفی زبان کے مابعد لسانیاتی تجربے میں متبادل اظہار نہ دے۔

(v) زبان کی کسی اور سطح پر کسی چیز کا متبادل بن جائے۔

جن حالات میں لغوی ترجمہ ممکن نہ ہو، ونے اور ڈاربلنٹ کا کہنا ہے کہ وہاں oblique ترجمے کی حکمت عملی اپنائی جانی چاہیے۔ ان کے بیان کردہ اگلی چار حکمت عملیاں oblique ترجمے کے ذیل میں آتی ہیں۔

iv- Transposition

یہ ایک جزو کلام کی دوسرے جزو کلام سے تبدیلی کا عمل ہے مگر اس سے معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ عمل لازمی یا اختیاری دونوں طرح سے ہو سکتا ہے۔ یہ جملے کے مختلف حصوں کی ترتیب الٹ کر یوں ترجمہ کرنا ہے کہ معنی میں تبدیلی نہ ہو۔ ونے اور ڈاربلنٹ کے خیال میں transposition وہ ساختیاتی تبدیلی کا عمل ہے جو شاید مترجمین سب سے زیادہ کرتے ہیں۔

v- Modulation

ترجمے میں وہ عمل ہے جو ماخذ زبان کے الفاظ کے معانی اور نقطہ نظر تبدیل کر دیتا ہے۔

مثلاً ''یہ کہنا مشکل نہیں ہے'' کا ترجمہ ''یہ کہنا آسان ہے'' کر دینا۔ Modulation کا جواز اسی صورت میں ممکن ہے جب ایسا جملہ لکھا جائے جو گرامر کے لحاظ سے تو درست ہو مگر ہدفی زبان میں اسے بامحاورہ اور مناسب نہ سمجھا جائے۔ ڈاربلنٹ اور ونے کا کہنا ہے کہ Modulation کسی بھی مترجم کی اچھائی کا معیار ہے کیونکہ Transposition کسی مترجم کی ہدفی زبان میں اچھی مہارت کو ظاہر کرتی ہے مگر Modulation دو زبانوں کے مزاج اور ذائقے سے آشنائی کا ثبوت ہے۔

- ٹھوس کے لیے مجرد یا مجرد کے لیے ٹھوس کی تبدیلی
- سبب اور علت کا باہمی متبادل
- جز اور کل کی تبدیلی
- ایک جزو کی دوسرے سے تبدیلی
- اصلاحات کی تبدیلی
- متضاد الفاظ کا خاتمہ
- معروف سے مجہول اور مجہول سے معروف کی تبدیلی
- وقت کے لیے جگہ کی تبدیلی
- (وقت اور جگہ کے حوالے سے) وقفوں اور حدود پر از سرِ نو غور
- علامات کی تبدیلی (بشمول متعین اور نئے استعاروں کے)

اس طریقے میں عوامل کی وسیع رینج شامل ہے اور بعض اوقات Modulation کے ذریعے کیے گئے اظہار متعین اظہار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

vi۔ Equivalence / ہم پلہ یا مساویت

جب دو زبانوں میں کسی ایک صورت حال کے بیان کے لیے اسلوبیاتی یا ساختیاتی ذرائع موجود ہوں تو ایک زبان سے ترجمہ کرتے وقت دوسری زبان میں اسی صورتِ حال کے لیے موجود اظہار استعمال کر لیا جاتا ہے۔ مساوی یا ہم پلہ الفاظ و اظہارات کی حکمتِ عملی عموماً

محاوروں اور ضرب الامثال کے ترجمے کے لیے استعمال ہوتی ہے مگر ہم پلہ حکمت عملی کو آزاد یا تخلیقی ترجمے کے مترادف عمل شمار نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ تخلیقی ترجمے میں مترجم کسی صورتِ حال کو مقامی تفہیم کے لیے ہدفی زبان کے محاورے کی مدد سے بیان کرتا ہے اور اس صورتِ حال کے مماثل کوئی ایسی صورت حال کی مدد لیتا ہے کہ ہدفی زبان کے قاری کو ماخذ زبان میں موجود صورتِ حال کا اندازہ ہو جائے جبکہ ہم پلہ حکمتِ عملی کا استعمال ہدفی زبان میں موجود بعینہٖ اسی صورتِ حال کے لیے مستعمل محاورے یا اظہار سے ہوتا ہے۔ انگریزی اور اردو میں ایسی صورتِ حال کی یعنی مساویت کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

انگریزی میں مستعمل تراکیب Apple of discord اور Bone of Contention کے لیے اردو میں ''وجہ نزاع'' کی ترکیب موجود ہے۔ مساویت کی ایک اور مثال انگریزی میں Apple of one's eye اور اردو میں ''ناک کا بال ہونا'' اور ''آنکھ کا تارا'' کی صورت میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں کسی حادثے یا مشکل سے بمشکل بچ نکلنے کو انگریزی میں A Narrow escape جبکہ اردو میں ''بال بال بچنا'' سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ضرب الامثال کی مثال کے طور پر انگریزی کی چند امثال اور اردو میں اس کے مساوی مستعمل امثال مندرجہ ذیل ہیں:

اردو	انگریزی
جیسا کرو گے ویسا بھرو گے	As you sow, so shall you reap
اول خویش بعد درویش	Charity begins at home
صفائی نصف ایمان ہے	Cleanliness is next to godliness
لوہے کو لوہا کاٹتا ہے	Diamond cuts diamond
تھوتھا چنا باجے گھنا	Empty vessels make the most noise
پہلے آیئے، پہلے پایئے	First come first served
غم بانٹنے سے کم ہوتا ہے	Grief divided is made lighter
جلدی کام خرابی کا	Haste makes waste

vii- Adaptation /ترمیم

ترجمے میں اگر یہ صورت حال درپیش ہو کہ ماخذ زبان میں بیان کردہ ثقافتی حوالہ ہدفی زبان میں موجود نہ ہو یا وہ زور پیدا نہ کرے جو ماخذ زبان میں مقصود ہے۔ اس کی ایک واضح مثال جو ونے اور ڈاربلنٹ نے دی ہے وہ انگریزی سے فرانسیسی میں ترجمہ کرتے ہوئے کرکٹ کے کھیل کی مثال ہے۔ انگریزی تہذیب میں کرکٹ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ فرانسیسی قارئین پر واضح نہیں ہو سکتی۔ ان کی تہذیب میں Tour de France وہی معنی اور زور یا تاثر پہنچائے گا۔ چنانچہ ترجمہ کرتے ہوئے اس تہذیبی حوالے کا تاثر مضبوط کرنے کے لیے وہاں ٹور ڈی فرانس کا حوالہ دے دیا جائے گا۔

یہ واضح ہے کہ ہر زبان کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ بہت کچھ اس کی تہذیبی عکاس بھی ہوتی ہیں اور دوسری زبان میں ترجمہ کے بعد وہ خصوصیات اس درجہ پر تاثر نہیں ہوتیں اس میں کسی زبان کی تخصیص نہیں خواہ عربی و فارسی ہو، اردو اور انگریزی یا دیگر زبانیں۔ کیونکہ زبانیں اہلِ زبان کی ترجمان ہوتی ہیں اور جو خصوصیات ایک قوم میں پائی جاتی ہیں ضروری نہیں کہ وہ دوسری قوم میں بھی پائی جائیں۔ کسی زبان کے الفاظ کو سن کر یا پڑھ کر اہلِ زبان کے ذہن میں جو نقشہ پھر جاتا ہے ترجمہ کے بعد دوسری زبان والے جن کے ہاں وہ باتیں وقوع میں نہیں آیا کرتیں وہ اس جملے سے جس کا ترجمہ ہوا ہے کما حقہ لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اردو مرثیے میں میر انیس کا ایک شعر مثال کے طور پر پیش ہے۔

جنگل سے جو آتی تھیں درندوں کی صدائیں
دم کرتی تھیں سیدانیاں بچوں پہ دعائیں

اس شعر میں بیان کردہ صورتِ حال ہندوستان کے مہذب گھرانے کی شاہزادیوں کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ محلوں میں رہنے والی، عزت و حرمت کے ساتھ عیش و فراخی میں گزران کرنے والیاں نازک دلوں کی مالک جن تک کوئی ہولناک آواز کبھی نہیں پہنچ پاتی۔ کسی حادثہ سے دو چار ہو کر آرام گاہوں کو چھوڑ کر مجبوراً جنگلوں اور صحراؤں میں سفر کر رہی ہوں اور کم سن

بچے ان کے ہمراہ ہوں۔ گرمی کی راتوں کا سناٹا ہو اور جنگل میں کسی درندے کی اگر آواز آئے گی تو ان نازک دلوں پر کتنا اثر کرے گی جنھوں نے کبھی یہ منظر دیکھا نہ ہو۔ مندرجہ بالا شعر سے یہ سب نقشہ سننے والوں کی آنکھوں میں بھر جاتا ہے اس لیے ہندوستان کے رہنے والے جتنا اس شعر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں دوسرے نہیں ہو سکتے۔ عربی میں ترجمہ کرنے کے بعد عرب کی عورتیں، جو باہر نکلتی اور صحراؤں اور جنگلوں میں بسر کرتے ہوئے، لڑائیوں کے مناظر دیکھے اور شدائد کو برداشت کیے ہوئے ہیں ان کو درندوں کی آواز سے کب خوف ہو گا۔ لہٰذا عربی میں ترجمہ کرنے سے عربوں کو وہ حظ قطعی نہیں حاصل ہو سکتا جو ہندوستانیوں کو حاصل ہو گا۔

> انتونی برمن (Antoine Berman) نے ترجمے کو بدیسی کی جانچ یا آزمائش کہا ہے۔[۲] یہ آزمائش دو سطح پر ہوتی ہے یعنی ایک سطح پر یہ اصل اور بدیسی کے باہمی تعلق سے معاملہ کرتی ہے جس میں کسی دوسرے ملک کے بدیسی فن پارے کو ہم اس کی تمام تر اجنبیت کے ساتھ متعارف کروانا چاہتے ہیں اور اس کا بدیسی پن رکھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ دوسری سطح پر ترجمہ اس بدیسی فن پارے کے لیے بھی آزمائش کا عمل ہوتا ہے کیونکہ جب متن کا سب سے اہم ہتھیار یعنی زبان تبدیل ہو جاتی ہے تو متن ترجمہ ہو کر اگر اپنے آپ سے مماثل ہوتا ہے تب بھی وہ خود سے اتنا ہی الگ ہو جاتا ہے۔ مماثل رہ کر بھی ترجمہ اصل متن سے اتنا دور اور ایک نیا اصل بننے کی طاقت رکھتا ہے کہ یہی کیمیا گری ترجمے کے عمل کی طاقت اور اہمیت کا اظہار بن جاتی ہے۔

انتونی برمن کے مطابق ترجمہ کسی بھی فن پارے کی ساختوں کو مختلف سطحوں پر توڑنے اور پھر توڑنے کی مختلف حکمت عملیوں کے ایک نظام کا نام ہے۔ یہ حکمتِ عملیاں یا رجحانات بارہ ہیں۔[۳]

۱	تاویل	Rationalization
۲	وضاحت	Clarification
۳	توسیع	Expansion
۴	توقیراور تشہیر	Ennoblement and Popularization
۵	ماہیتی/نوعیتی تعسیر	Qualitative Impoverishment
۶	مقداری/کمیتی تعسیر	Quantitiative impoverishment
۷	آہنگ کی تباہی	The destruction of rhythms
۸	اہمیت کے زیر سطحی نیٹ ورک کی تباہی	The destruction of underlying networks of significance
۹	لسانی بُنت کی تباہی	The destruction of linguistic patternings
۱۰	مقامی نیٹ ورک کی تباہی یا ان کو بدیسی بنانے کا عمل	The destruction of vernacular network or their exoticization
۱۱	تراکیب اور محاوروں کی تباہی	The dertruction of expressions and idioms
۱۲	زبانوں کے تراکب کی معدومیت	The effacement of the superimposition of languages

ترجمے کے ان مستعمل رجحانات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے کیونکہ ان میں سے اکثر ہی دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ترجمے کی تکنیکوں کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔

۱۔ تاویل

کسی بھی نثری متن میں بنیادی اہمیت رموزِ اوقاف کی ہے ان میں ذرا سا ردو بدل معانی کو کچھ کا کچھ کر دیتا ہے۔ترجمے کی تکنیک کے طور پر تاویل کا طریقہ یہ ہے کہ جملوں کی

ترتیب نئے سرے سے ہوتی ہے۔اس کی ایک مثال دوستو وسکی کے نثری اسلوب کا ترجمہ ہے یا پروست اور استاں دال کے جملے جو اردو میں اسی طرح منتقل نہیں ہو سکتے لہٰذا ممکن ہے کہ جملے کو ازسرِ نو ترتیب دیتے ہوئے ایک منطقی ترتیب (discursive order) کو سامنے رکھا جائے۔تاویل میں عموماً اصل فن پارے میں موجود رسمی اور غیر رسمی، مرتب و غیر مرتب، جامد اور مجرد کے تعلق کو الٹ دیتی ہے اور عموماً اس طریقۂ ترجمہ میں اصل فن پارے کے بنیادی رجحانات کو قلبِ ماہیئت (deform) کر دیا جاتا ہے۔

۲۔ وضاحت

متن کے ترجمے میں وضاحت سے مراد یہ ہے کہ یہ کسی فن پارے کو ترجمہ کرتے ہوئے اس میں موجود ابہام یا غیر واضح کو واضح بنانے کا رجحان ہے۔کسی بھی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ہونے والے فن پارے کا ایک مقصد ہدفی زبان کے قاری کے لیے قابل فہم ہونا بھی ہے۔لہٰذا اس میں کوئی عیب نہیں کہ مترجم مبہم کو غیر مبہم کرے، بلکہ ترجمے کا حسن ہے۔ مترجم چونکہ رابطہ کار کا کام کرتا ہے اور متن اور قاری کے درمیان ایک ایسے نقطے کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک طرف تو اپنی نگاہ سے کسی متن کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف قاری کو اسی نقطے سے دوسری جانب دکھانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔یہ وضاحت دو طریقوں سے ہوسکتی ہے یعنی ایک تو اس ابہام کو دور کرنا جو متن میں عمداً نہیں رکھا گیا جبکہ دوسرا طریقہ اس مبہم عبارت یا خیال کو واضح کرنا جو عملاً اور ارادی طور پر اصل متن میں رکھا گیا ہو۔یہ وضاحت ایک اور رجحان کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہے جسے وضاحت کی اگلی کڑی کہا جا سکتا ہے یعنی توسیع۔

۳۔ توسیع

ہر ترجمہ اصل متن سے حجم میں بھی زیادہ ہوتا ہے اور تفصیل میں بھی۔ تاویل اور وضاحت دو ایسی تکنیکیں یا رجحان ہیں جن کی بدولت ترجمے میں وسعت یا پھیلاؤ آتا ہے۔ دراصل ترجمہ ہر اس تہہ کو کھولنے کا عمل ہے جو متن میں لگی ہوتی ہے۔یہ توسیع کبھی تو متن کی

معنوی سطح کو بھی پھیلانے کا سبب بنتی ہے اور بعض اوقات اس سے متن میں اضافہ تو ہوتا ہے مگر وہ جملوں کے پھیلاؤ اور ترجمے کے حجم میں اضافہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس توسیع سے فن پارے کے اصل بہاؤ اور توازن میں فرق آتا ہے۔

۴۔ توقیر

یعنی متن کو وقار بخشنا۔ اس طریقۂ ترجمہ میں اصل متن کو بنیاد بنا کر ہدفی زبان کے مقفّٰی و مسجع اسلوب میں جملے اور از سرِ نو تحریر کیے جاتے ہیں۔ یعنی شاعری میں اصل نظم کے خیال کو بہتر زبان اور طرز میں لکھا جاتا ہے۔ اس میں خام مواد کے طور پر اصل متن کو استعمال کیا جاتا ہے اور یوں اصل متن قربان بھی ہو جاتا ہے۔ ادبی تراجم میں یہ عمل بہت زیادہ ہوتا ہے جبکہ طبعی سائنسز میں متن کو آسان اور عام فہم زبان میں قدرے دلچسپ انداز میں ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ پڑھے جانے کے قابل بن سکے۔

۵۔ ماہیتی/نوعیتی تعسیر

زرخیزی میں کمی یا تعسیر سے مراد یہ ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحات، بیانیوں اور اجزائے کلام کا ترجمہ ایسی اصطلاحات، بیانیوں اور اجزائے کلام سے کیا جائے جن کی وہ اہمیت اور بھرپور معنی نہ ہوں جو اصل زبان میں ان کو حاصل تھے۔ یعنی وہ لفظ جو اصل متن اور زبان کے نظام میں (Iconic) تمثالی حیثیت رکھتا ہو جب اسے ترجمہ کیا جائے تو وہ ہدفی زبان میں اس مرکزی اور روایتی اہمیت کا مالک نہ ہو۔ کسی لفظ یا اصطلاح کے تمثالی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد جو چیز ہو اس کی تصویر گویا بن جائے۔ مثلاً اس تمثالیت کو مشتاق احمد یوسفی کے بیان کردہ ان جملوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے:

> ......مبداء کو 'مبدء' 'پرواہ' کو 'پروا' اور 'وطیرہ' کو 'وتیرہ' لکھنا، ہم نے انھی سے سیکھا اور یہ بھی انھی سے معلوم ہوا کہ 'عطائی' اور 'طوطا' کا صحیح املا 'اتائی' اور 'توتا' ہے! جوش اصلاح میں ہم تو 'طوائف' کو بھی 'ت' سے لکھنے پر طیار تھے، مگر طوطے والی بات دل کو نہیں لگی۔ اس لیے کہ 'توتے'

کو اگر ط سے لکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ زیادہ ہرا معلوم ہوتا ہے، بلکہ ط
کا دائرہ ذرا ڈھنگ سے بنائیں تو چونچ بھی نظر آنے لگتی ہے۔[۴]

طوطے کے ساتھ وابستہ تمثالیت کو انھوں نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے اور یہ تمثالیت دوسری زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے باقی رہنی چاہیے، ورنہ یہ ماہیتی تعسیر ہو جائے گی۔

۶۔ مقداری/کمیتی تعسیر

لفظوں کی تعسیر یا ان کی اہمیت اور ثروت کم کرنے میں ایک طرف تو ان کی تمثالیت میں فرق آ جانا شامل ہے اور کمیتی یا مقداری عسرت ان کا لغوی طور پر متاثر ہونا ہے۔ مثلاً کسی بھی ادبی متن کی زبان ثروت مندی میں کثیر الجہات ہوتی ہے یعنی علامتوں کا ایک نظام اس متن میں ہوتا ہے یہ علامتیں کئی معانی اور تہہ دار ہوتی ہیں۔ جب ترجمے میں ان معانی یا علامتوں میں سے کوئی بھی رہ جائے، جو کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ترجمہ ان تمام تر معانی یا تہہ داری کو منتقل نہیں کر پاتا۔ ترجمے کی یہ ناکامی یا محدودیت ہی کمیتی عسرت یا تعسیر کہلاتی ہے۔

ترجمے میں یہ عسرت اس پھیلاؤ یا توسیع کا نتیجہ ہوتی ہے جو مترجم کی مجبوری ہوتی ہے لہٰذا قدرے طویل ترجمہ مقابلتاً کم ثروت مند اور کم بھرپور متن ہوتا ہے۔

۷۔ آہنگ کی تباہی

ناول معنوی یا علامتی سطح پر ایک مکمل نظام ہوتا ہے۔ اپنے حجم کے لحاظ سے بھاری اور طویل ہونے کے باوجود اس میں ایک ربط ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے علامتی نظاموں کو باہم مربوط کر کے ایک مکمل ناول تشکیل پاتا ہے۔ یہ نظام اسے ایک خاص آہنگ عطا کرتے ہیں۔ ترجمہ کرتے ہوئے یہ آہنگ کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہتا ہے اور ناول کو روانی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ جتنا بھی خراب ہو، متن میں یہ مرکزیت اور ہم آہنگی جیسے تیسے برقرار رہتی ہے اور اسے پڑھنے کے قابل بناتی ہے۔ شاعری میں موجود آہنگ ترجمہ نہیں ہو پاتا اور اسی کے متعلق کہا گیا ہے کہ جو کچھ ترجمے میں نہیں آ پاتا دراصل وہی شاعری ہوتی ہے مگر ناول کے

ترجمے میں عموماً اس آہنگ کو مترجم خراب بھی کرتا ہے۔ جس کی ایک مثال رموز اوقاف کی تبدیلی یا استعمال ہے۔ ممکن ہے کہ مترجم ایک جملے میں استعمال کیے گئے اس رموزِ اوقاف کو ترجمہ کرنے کے عمل میں پندرہ یا بیس کر دے۔

۸۔ اہمیت کے زیر سطحی نیٹ ورک کی تباہی

ہر ادبی متن کا ایک تحتی متن ہوتا ہے جو چند الفاظ کے ظاہری معانی کے ساتھ ساتھ ان کے پوشیدہ معانی بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی ناول کے متن میں پورے ناول میں وقفے وقفے سے بعض الفاظ کا ایک تسلسل سے ظاہر ہونا دراصل وہی تحتی متن ہے جو ایک مربوط نظام میں مرقوم ہوتا ہے۔ ان الفاظ کی اپنی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی مگر اس زیر سطحی نیٹ ورک کی علامتی حیثیت ہوتی ہے۔ عموماً ترجمے کے عمل میں یہ نیٹ ورک منتقل نہیں ہو پاتا یا ٹوٹ جاتا ہے۔ مثلاً کسی خاص منظر کو قاری کی نظر میں واضح کرنے کے لیے مصنف بعض افعال کی بعض مخصوص حالتیں، اسمائے صفت استعمال کرتا ہے۔ مترجم جب ان کے متبادل الفاظ یا تو استعمال نہیں کرتا، یا ان کے بجائے کچھ اور لفظ شامل کر دیتا ہے تو یہ مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

۹۔ لسانی بُنت کی تباہی

متن کی لسانی بنت میں محض علامتیں اور استعارے ہی شامل نہیں بلکہ جملے کی اقسام اور ساختیں بھی شامل ہیں۔ یعنی کوئی مصنف زبان کو کیسے استعمال کرتا ہے۔ یہی چیز اسلوب بھی کہلاتی ہے۔ ترجمے کے عمل کے مختلف رجحانات مثلاً تاویل، توسیع اور وضاحت وغیرہ جہاں زبان کی مختلف علامتوں اور لغوی سطح پر الفاظ کے استعمال میں خرابی کا سبب ہیں وہیں نحوی سطح پر بھی زبان کو مترجم اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ یعنی ترجمہ، مترجم کے اسلوب کا حامل ہوتا ہے۔ ایک زبان کی موت اور دوسری زبان کا احیاء ترجمے کی خصوصیت ہے اور ترجمہ جتنا بھی منظم اور مربوط ہو، بہرحال غیر مربوط ہوتا ہے کیونکہ وہ اصل کو تباہ کر کے ظہور پاتا ہے۔

۱۰۔ مقامی نیٹ ورک کی تباہی یا ان کو بدیسی بنانے کا عمل

ہر زبان اپنے خمیر میں مقامیت کی حامل ہوتی ہے۔ خصوصاً نثر، کیونکہ بول چال کی زبان کا ترقی پا کر ادبی زبان بن جانا ایک معلوم حقیقت ہے۔ لہٰذا ہر نثری فن پارے میں مقامی/ دیسی زبانوں کا ذائقہ اور مہک ضروری ہے۔ فن پارے میں قطعیت اور واقعیت کے لیے ضروری عنصر دیسی پن ہے کیونکہ مہذب اور درآمد شدہ زبان اس وضاحت اور تمثالیت کی حامل نہیں ہوسکتی جو نثر کے لیے لا ینفک ہے۔ مزید برآں، عموماً نثر نگاروں کے سامنے دیسی زبانوں کے ذائقے اور بھرپور ثروت مندی کو دوبارہ سے احاطۂ تحریر میں لانا بھی ہوتا ہے۔ زبانوں سے دیسی پن یا مقامی الفاظ کا معدوم ہو جانا کسی المیے سے کم نہیں۔

مقامی اور دیسی زبانوں کے الفاظ کو محفوظ رکھنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ان کو لکھتے ہوئے Italics میں لکھ دیا جاتا ہے اور یا پھر ان کو ہدفی زبان کی کسی مقامی یا دیسی زبان میں تبدیل کر لیا جاتا ہے اور ایسا ہی کوئی لفظ جو اسی معنی یا استعمال کا ہو منتخب کر لیا جاتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دیسی اور مقامی الفاظ اپنی مٹی سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ اس پودے کی طرح ہیں جو اجنبی سرزمین میں جڑیں نہیں پکڑتا۔ لہٰذا یہ کہنا مناسب ہو گا کہ ترجمہ صرف متمدن زبانوں میں ہوسکتا ہے۔ یعنی ایک متمدن اور شائستہ زبان کا ترجمہ دوسری متمدن زبان میں کیا جا سکتا ہے کہ وہ بدیسی پودے ہوتے ہیں جو ہر زمین میں نہیں اگ سکتے ہیں۔

۱۱۔ تراکیب اور محاوروں کی بربادی

نثر الفاظ کی بہترین ترتیب کا نام ہے جو تمثالوں، تراکیب، محاوروں، ضرب الامثال اور اجزائے کلام سے بھرپور ہوتی ہے۔ چونکہ نثر مقامیت سے مملو ہوتی ہے اور یہ تمام خوبیاں علاقائی اور دیسی زبانوں اور بولیوں سے کشید کرتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کا متبادل تمثال، محاورہ، ضرب المثل وغیرہ دوسری زبان میں مل جاتا ہے کیونکہ عموماً انسانی دانش بنیادی طور پر یکساں ہے مگر اس حقیقت کے باوجود کسی محاورے یا ضرب المثل کا متبادل تو مہیا کیا جا سکتا ہے، البتہ اسے ہم ترجمانی نہیں کہہ سکتے، ترجمہ، متبادلات کی تلاش کا عمل نہیں ہے کیونکہ اصل

زبان کے محاوروں، ضرب الامثال، تراکیب کے ساتھ وابستہ تمام ظاہری اور زیرِ سطحی معنوی اور فکری تاریخ دوسری زبان میں بعینہٖ موجود نہیں ہو سکتی نہ ابلاغ کر سکتی ہے۔ لہٰذا ہم پلہ یا مساویت کے حامل تراکیب و امثال اس جیسی یا مانند صورت حال کی جھلک تو دے سکتی ہیں مگر بعینہٖ وہی نہیں دکھا سکتیں اور یہی ترجمے کی مشکل بھی ہے۔

۱۲۔ زبانوں کے تراکب کی معدومیت

عموماً کسی نثری فن پارے میں دو یا دو سے زیادہ زبانیں مرکب ہو کر مصنف کا اسلوب جنم دیتی ہیں۔ ایک واضح اور مرکزی زبان، دوسری کوئی بولی، یا مقامی لہجے میں بولی جانے والی زبان، مقامی لہجہ یا بولیاں ایک یا ایک سے زیادہ بھی ہو سکتی ہیں۔ متن میں مرکزی اور ذیلی زبانیں باہمی کشمکش میں بھی رہتی ہیں۔ اور ایک مستحکم اور متحد متن بھی تشکیل کرتی ہیں۔ ترجمہ اس تراکب کو برباد کرنے کا عمل ہے۔ یعنی مترجم تو مرکزی زبان کو اپنا منتہائے نظر بنائے گا اور اسے ہی ترجمہ کرے گا۔ اگر ناول کے ترجمے کو مثال کے طور پر لیا جائے تو ناول کے کرداروں کے باہمی مکالمے اور ان میں لہجوں کا فرق جو علاقائی، عقلی اور سماجی تفرقات کی بناء پر ہوتا ہے اور کسی بھی زبان کی ثروت مندی اور وسعت کا غماز ہوتا ہے، ترجمے کا مطمحِ نظر نہیں ہے۔

یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ سب سے مشکل کام ایک زبان کے لفظ کا دوسری زبان میں متبادل لفظ ڈھونڈنا ہے۔ لفظ بہ لفظ ترجمے میں یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ ایک زبان میں موجود لفظ کا دوسری زبان میں معنی و مفہوم پہنچا نہیں پا رہا ہوتا ہے یا مترجم کو اظہار کا ادھورا پن محسوس ہو رہا ہوتا ہے، وہاں پر دو طریقے قابلِ عمل ہیں یعنی ایک تو یہ کہ مترجم ہدفی زبان میں اسکے مساوی یا ہم پلہ لفظ یا بیانیے کو منتخب کر لے جو اس صورتِ حال کو بیان کرنے کے لیے ہدفی زبان میں استعمال ہوتا ہے اور یا پھر وہ ترجمے کے دیگر طریقوں پر عمل کرے۔ یعنی ترجمے کے لیے لغت اور مناسب اظہاریے کی تلاش میں مترجم اپنی تلاش کو دو سمتوں میں جاری رکھتا ہے یعنی عمودی اور افقی۔

عمودی ترجمہ

عمودی طریقہ ترجمہ کو مندرجہ ذیل شکل کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔

S.L	:	ماخذ زبان
|		|
T.L	:	ترجمے کی زبان
|		|
علاقائی/ذیلی زبانیں	:	علاقائی/ذیلی زبانیں

یعنی اگر ماخذ زبان انگریزی اور ہدفی زبان اردو زبان ہے تو کسی لفظ کا ترجمہ ہدفی زبان کے کسی مناسب اور معقول لفظ سے نہیں ہو رہا تو ماخذ زبان کا وہی لفظ بعینہ قبول کیا جا سکتا ہے جو نہ صرف اس زبان کے لغت میں اضافے کا سبب بنے گا بلکہ ایک نئی صورتِ اظہار کی فراہمی بھی ہو جائے گی۔ لیکن اگر ماخذ زبان کا مذکورہ لفظ یا صورتِ اظہار اردو کے مزاج کے مطابق نہیں ہے اور زبان میں کھردرے پن یا غرابت کا تاثر پیدا ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں شاعرانہ اظہار کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے تو اردو اپنے اردگرد موجود ان زبانوں کی مدد لے سکتی ہے جن میں ادبی روایت اتنی مضبوط اور توانا نہیں ہے۔ یعنی وہ علاقائی زبانیں جو لوک ادب کی صورت میں توانا روایت کی مالک اور اظہار کے وسائل میں مقامی رنگ و بو کی مالک ہیں۔ بلوچی، سندھی، پنجابی، براہوی، شینا اور ہندکو جیسی تمام زبانیں جنھیں علاقائی زبانوں کی حیثیت حاصل ہے، کی مدد سے نہ صرف قومی زبان میں علاقائی رنگ شامل کیا جا سکتا ہے بلکہ ترجمے میں بھی مقامی رنگ ابھارا جا سکتا ہے۔ یہ عمل قومی یک جہتی کے فروغ کے ساتھ ساتھ مقامی و علاقائی زبانوں کے فروغ اور دوطرفہ اثر پذیری کی بدولت ان کی زندگی اور تحرک کا سبب بھی بنے گا۔ مناسب لفظ کا مطلب حواشی میں دیا جا سکتا ہے تا کہ وہ صرف اس علاقے کے لیے نہیں بلکہ تمام اردو دان دنیا کے لیے مانوس اور قابلِ فہم ہو سکے۔ یوں زبان میں

دوطرفہ اثرپذیری کا مظاہرہ ہوگا یعنی زبان اپنے سے توانا روایت کی مالک زبان کے لیے متبادل ذریعہ اظہار اپنے سے کمتر یا کمزور روایت والی اپنی ہی کسی زبان سے لیا جائے گا تو زبانوں مین مرعوبیت کا احساس پیدانہیں ہوگا۔یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ کمزور شعری وادبی روایت کا مطلب کمتر یا کمزوراور بےاثر زبان ہونا بالکل بھی نہیں ہوتا۔

افقی ترجمہ

افقی ترجمہ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے آفاق کی وسعتوں کا حامل ہے اور اسے مندرجہ ذیل شکل سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ترجمہ کی زبان

|

ہمسایہ زبانیں <—— ہدفی زبان ——> ہمسایہ زبانیں

یعنی اگر ہدفی زبان سے مراد اردو ہے تو اردو اپنی تمام ہمسایہ زبانوں کے ادبی ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔اس میں علاقائی لحاظ سے قربت کی حامل زبانوں کا ادب مثلاً فارسی، بنگلہ اور ہندی وغیرہ سے خوشہ چینی نیز مضبوط ادبی روایتوں سے اثر پذیری شامل ہیں۔یوں ان دونوں طریقوں کو اگر ایک ہی شکل میں ظاہر کیا جائے تو صورتِ حال کچھ یوں بنتی ہے۔

ماخذ زبان

|

ہم پلہ و ہمسایہ زبانیں <—— ترجمے کی زبان ——> ہم پلہ و ہمسایہ زبانیں

| |

علاقائی زبانیں

یوں ترجمہ ایک عالمگیر سرگرمی کی صورت میں سامنے آتا ہے جس میں انسانی برادری بھائی چارے اور باہمی اثر پذیری و اثر انگیزی کے ایک ایسے سلسلے میں جڑی نظر آتی ہے جہاں

نہ کوئی کمتر ہے نہ برتر بلکہ ہر زبان و ادب کی حیثیت ایسے جزو ترکیبی کی ہو جاتی ہے جو اس امر پر مہر ثبت کر دیتا ہے کہ دراصل تمام علمی و ادبی سرمایہ عالم انسانیت کی میراث ہے نیز انسانوں کے وسائل و ذرائع اظہار میں یکسانیت موجود ہے۔ یوں ترجمہ محض علمی و ادبی سرگرمی نہیں بلکہ عالمگیر انسانی بھائی چارے کا علمبردار بن جاتا ہے اور ریناتو پوگی اولی کے مطابق مترجم ادب کی جمہوریہ کا سب سے عالمگیر شہری بن کر سامنے آتا ہے۔

ترجمے میں ہدفی زبان کے اندر علاقائی، ذیلی، ہم پلہ و مساوی السنہ سے خوشہ چینی کے ذریعے ترجمے کی زبان کو زیادہ رچاؤ اور چاشنی نصیب ہوتی ہے۔ اردو زبان چونکہ خاص طور پر اخذ و انجذاب کی زبان ہے لہٰذا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے علاقائی اور ہم پلہ زبانوں سے مدد لینا نہ صرف ان زبانوں کی تکریم کے مترادف ہے بلکہ اس سے خود اردو زبان کا دامن کس قدر مالا مال ہوتا ہے، اس کی ایک مثال شوکت واسطی کی ''فردوسِ گم گشتہ'' ہے۔ شوکت واسطی نے تمام قریبی زبانوں سے جو الفاظ اٹھائے وہ اردو زبان کے دامن میں آ کر اسی کا ایک حصہ لگنے لگے ہیں اور ایک ذرا سی توجہ اور محبت کے ذریعے ان کی ترویج کے بعد انھیں مقبولِ عام بنایا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

1. Munday, Jeremy "Introducing Translation Studies", Routledge, Oxan, p.56-58

2. Berman, Antoion "Trials of Foreign" The Translation Studies Reader editor Lawrence Venuti, Routledge, 2003.

3. Berman Antoine

۴۔ مشتاق احمد یوسفی، خاکم بدہن، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱

باب سوم

ترجمے کی تاریخ اور نظریات

○

ترجمے کی اجمالی تاریخ

صدیوں سے دنیا میں تقریباً ہر جگہ ترجمانی یا ترجمہ کیا جاتا رہا ہے۔نوآبادیاتی نظام کی پھیلتی جڑیں ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کو ثابت کرنے کا اہم عنصر ہیں۔ترجمے کی ضرورت مقامی لوگوں سے میل جول کے لیے ہی نہیں بلکہ مذہبی تبلیغ کے لیے بھی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ چونکہ کتاب میں زیادہ تر انگریزی سے اردو میں ادبی متن کے ترجمے سے متعلق بات کی گئی ہے لہٰذا ترجمے کی تاریخ کو یورپ اور برصغیر کے محدود تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

یورپ میں

یورپ میں رومیوں نے ترجمے کو رواج دیا اور اس پر نظری بحثیں شروع کیں۔ ویسے تو شاید ترجمے کا عمل اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ بنی نوع انسان خود مگر باقاعدہ طور پر ہورلیس اور سسرو کو یورپ/مغرب میں بابائے ترجمہ خیال کیا جاتا ہے۔ یونانی زبان سے کیے گئے تراجم پر مبنی

ان کے کارنامے زبان وادب کو نئے خیالات اور اسالیب کی عطا کے ساتھ ساتھ علم کا ذریعہ بھی تھے۔

یورپ کی سرزمین پر عیسائیت کی اشاعت کے بعد ترجمے نے مذہبی رخ اختیار کر لیا۔ اس کو روکنے کے لیے اگرچہ بڑی سخت سزائیں بھی رکھی گئیں مگر یہ سلسلہ جاری رہا۔ انجیل مقدس کے ترجمے کا ابتدائی دور زبان و بیان کی خوبصورتی اور مذہبی جوش وخروش کا نتیجہ ہے مگر بعد ازاں سترھویں صدی میں برپا ہونے والی مذہبی اصلاحی تحریک کی بدولت سیاسی رخ اختیار کر گیا۔

جون وائیکلف (۸۴۔۱۳۳۰) پہلا مترجم تھا جس نے انجیل مقدس کا مکمل ترجمہ لاطینی سے انگریزی زبان میں کیا (واضح رہے کہ انجیل مقدس عبرانی زبان میں نازل ہوئی تھی)۔ ولیم ٹنڈل (۱۵۳۶۔۱۴۹۴) نے انجیل کا ترجمہ نہ صرف انگریزی زبان میں کیا بلکہ اسے شائع بھی کیا کیونکہ تب تک پرنٹنگ پریس ایجاد ہو چکا تھا۔ ٹنڈل نے کلیسا کی روش کو تنقید کا نشانہ بنایا جس کے مطابق عام آدمی تک خدا کا کلام پہنچنے نہیں دیا جا رہا تھا۔

ترجمے کا عمل مقامی بولیوں ٹھولیوں کو مکمل اور آزاد زبانیں بنانے کا عمل ہے۔ یورپ کی کئی بولیاں بھی ترجمے کی بدولت زبانوں کا درجہ اختیار کر گئیں۔ کنگ الفریڈ نے لوگوں کو لاطینی متون کے انگریزی ترجمے کی ترغیب دلائی تا کہ زبان کی کوئی ادبی شکل متعین ہو۔ زبان وادب کے دامن کو مالا مال کرنے کے ساتھ ترجمہ نہ صرف نئے خیالات سے واقفیت کا ذریعہ اور سیاسی ہتھیار تھا بلکہ اسلوبیاتی سطح پر بہتری اور تنوع کی مشق بھی تھا۔ اس دور کے تراجم کو گیانفرانسو فولینا نے ۱۷۷۳ میں دو اقسام میں تقسیم کیا یعنی افقی اور عمودی ترجمہ۔ دو ہم پلہ زبانوں کے باہمی ترجمے کو افقی ترجمہ کہا جاتا ہے اور ماخذ زبان کے زیادہ بھرپور اور بلند درجہ کی بدولت ترجمے کی زبان کو پہلے سے زیادہ بھرپور بنانے کی بدولت ہونے والے ترجمے کو عمودی ترجمہ کہا جاتا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ کے بعد بھی ترجمے کا عمل یورپ میں جاری وساری رہا بلکہ اس نے پرنٹنگ

پریس اور نشاۃِ ثانیہ کی بدولت زیادہ رفتار پکڑ لی۔ تھامس ویٹ اور سسرے جیسے مصنفین نے نہ صرف تراجم کیے بلکہ بار بار کیے اور ہر ترجمے کا جائزہ باریک بینی سے لیا جاتا تھا۔ اس دور کے تراجم کی ایک دلچسپ خاصیت یہ تھی کہ انھیں ترمیم، حذف یا اضافے کے ذریعے وقتاً فوقتاً جدت بخشی جاتی تھی۔ نئی دنیاؤں کی دریافت کے اس دور میں ترجمے نے اسالیب کے تنوع اور جدت کے ساتھ ساتھ ادبی مسائل کے تعین اور حل میں مدد دی۔ یوں ترجمہ سولہویں صدی (جب نشاۃ ثانیہ کا آغاز تھا) میں علم کی اس عالمگیر میراث سے خوشہ چینی کے ساتھ ساتھ یورپ میں مذہبی اور ادبی مسائل و افکار میں ہلچل پیدا کرنے کا باعث بنا۔

سترھویں صدی میں سائنس کا عروج شروع ہوا اور قدیم مذہب اور جدید سائنس کی کشمکش نے لوگوں کے اذہان میں مخمصہ پیدا کر دیا۔ اس دور کی سیاست نے اس مخمصے کو مزید بڑھاوا دیا۔ فرانسیسی ادبی منظر نامے میں خصوصاً اور یورپی ادب میں عموماً کلاسیک ادب کا ترجمہ اور اسلوب کی نقل کا رجحان غالب تھا۔ یہ نقل اس دور میں غلامانہ روش نہیں بلکہ قابلِ فخر اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا ایک اہم وسیلہ سمجھی جاتی تھی۔ انگلستان کے سر جون ڈینم کی دلیل یہ تھی کہ اصل مصنف اور مترجم دونوں ہم پلہ ہیں مگر ان کے معاشرتی اور زمانی سیاق و سباق میں فرق ہوتا۔

اٹھارویں صدی میں ہر مصنف شاعر اور ڈراما نگار نے ترجمے کو قابل توجہ سمجھا اور ایک تصنیف کے کئی کئی تراجم کیے گئے۔ اپنے پسندیدہ مصنفین کے اسلوب کی پیروی قابل فخر سمجھی جاتی تھی۔ رومانوی تحریک نے ترجمے کے فن کو نئی زندگی بخشی۔ مصنف یا تخلیق کار کو الہامی وجدان کا مالک قرار دے دیا گیا ور ساتھ ہی مترجم کے متعلق نظریات میں بھی تبدیلی آ گئی۔ سوسن بیسنٹ اس دور میں فن ترجمہ کے متعلق دو نمایاں رجحانات کا سراغ لگاتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ایک رجحان تو مترجم کو بھی تخلیقی صلاحیتوں کا مالک قرار دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے انتخاب اور فن کے ذریعے ترجمہ کرنے والی زبان اور ادب کو مالا مال کرتا ہے جبکہ دوسرے رجحان کے مطابق مترجم محض کسی متن یا مصنف کو دوسری زبان میں متعارف کروانے کا مشینی کام کرتا ہے۔

فریڈرک (Schleiermacher 1768-1834) تھامس کارلائل (۱۸۸۱۔ ۱۷۹۵) دانتے گبریل روزیٹی (۸۲۔ ۱۸۲۸) اور ولیم مورس (۱۸۹۶۔۱۸۳۴) جیسے نامور مترجمین مابعد رومانوی دور پر چھائے رہے۔ انھوں نے نہ صرف نظری بلکہ عملی تراجم کے ذریعے قارئین کے دل جیتے۔ ولیم نورس کے تراجم میں (Norse Sagas) ہومر کی اوڈیسی، ورجل کی اے نیڈ، قدیم فرانسیسی رومانوی تحریریں شامل ہیں۔ ولیم مورس کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت ترجمہ ہونے والی زبان کے الفاظ کو ترجمہ کرنے والی زبان میں بعینہٖ محفوظ کرنا ہے۔

ماخذ زبان کے الفاظ کو ہدفی زبان میں قبول کر کے ماخذ زبان کے دامن کو وسیع کرنے کا عمل وکٹورین مترجمین نے بھی جاری رکھا۔ فٹز جیرالڈ، عمر خیام کی رباعیوں کے تراجم کے ذریعے میتھیو آرنلڈ اور ہنری وڈز ورتھ اور لانگ فیلو کے ساتھ اپنا نمایاں مقام رکھتا ہے۔

ترجمے کے رجحان کے حوالے سے بیسویں صدی کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نصف اول میں تو وکٹورین نظریہ فنِ ترجمہ ہی غالب رہا۔ ترجمہ کو لفظی ترجمے کے تصورات کے حوالے سے ہی جانا جاتا تھا۔ ایذرا پاؤنڈ جس کے عملی تراجم اور نظریات نے فن ترجمہ کو عروج بخشا اسی دور کا ایک ممتاز نام ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ابلاغی اور لسانیاتی نظریات کا ارتقا ہوا ان نظریات کا اطلاق ترجمے پر بھی کیا گیا۔ گھٹتے ہوئے فاصلوں نے دنیا کو ایک ایسے گاؤں کی شکل دے دی ہے جہاں ہر کوئی دوسرے سے باخبر ہے۔ باخبر دنیا میں ترجمہ اایک اہم عنصر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جو نہ صرف دوسری تہذیبوں سے واقفیت کا ذریعہ ہے بلکہ ثقافتوں کا تنوع اور برتری ثابت کرنے کا وسیلہ بھی۔

برصغیر میں

برصغیر پاک و ہند میں ترجمے کی تاریخ نوآبادیاتی نظام کے ساتھ شروع ہوئی۔ مغلوں کی زبان فارسی تھی اور یہی ملک کی سرکاری زبان بھی تھی۔ عربی مذہبی زبان تھی اور عوام الناس

اپنی مقامی بولیوں میں بات کیا کرتے تھے۔ انگریز حکمرانوں نے مقامی زبانوں میں عموماً اور اردو زبان میں تراجم پر خصوصی توجہ دی۔ اردو ادب کے ارتقا اور تشکیل میں بہت حد تک یورپی زبانوں کے سرمایہ ادب کا عمل دخل ہے۔ ترجمے کی بات کریں تو فارسی میں ہونے والا ترجمہ قرآن اردو ترجمے سے کہیں پہلے ہوا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے تبلیغی مقاصد کے لیے قرآن کا ترجمہ عربی سے فارسی میں کیا۔ مولانا شاہ شفیع الدین نے سب سے پہلے قرآن کا اردو ترجمہ کیا تاہم اس بات کا تعین کرنا مشکل ہے کہ یہ ترجمہ عربی متن سے براہِ راست کیا گیا یا فارسی ترجمے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ تاہم یہ ترجمہ لفظی ترجمہ ہے اور اسی لیے اسے سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ شاہ شفیع الدین نے قریباً ۱۷۷۶ء میں یہ ترجمہ کیا اس کے چند سال بعد ۱۷۹۵ء میں ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے بھی مقابلتاً رواں اور بہتر ترجمہ قرآن کیا۔

شاہ میراں جی حسن خدا نما (وفات ۱۶۵۹ء) پہلے اردو مترجم ہیں ان کے کیے گئے تراجم میں شرحِ تمہیدات، اور شرح مرغوب القلوب، یادگار ہیں۔ مرزا حامد بیگ (۱) کے مطابق شرح تمہیدات ایک قدیم فارسی تصنیف، تمہیدات عین القضات مصنفہ عبداللہ بن محمد ہمدانی (المعروف عین الغزالی) کی شرح اور ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے ۱۶۰۳ء میں کیا۔ سب رس جو اردو کا اولین نثری ترجمہ خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۶۳۵ء میں ملا وجہی نے کیا۔ میراں یعقوب نے رکن احمد الدین دبیر کی کتاب ''شمائل الاتقیاء'' کا ترجمہ کیا اسی دور میں ہونے والے دیگر تراجم میں معرفت السلوک (۱۷۰۴ء) طوطی نامہ اور کربل کتھا (۱۷۳۱ء) وغیرہ شامل ہیں۔ اگرچہ اس عہد میں چند کتب انگریزی سے بھی ترجمہ کی گئیں مگر زیادہ تر فارسی اور عربی سے ہی تراجم کیے جاتے رہے۔

انگریز حکمرانوں کے زیر اثر ہونے والے تراجم میں انجیل مقدس کے اردو ترجمے اور اکا دکا کتابوں کے علاوہ باقاعدہ منظم طریقے سے ہونے والے تراجم کے سلسلے میں ہمیں فورٹ ولیم کالج کی خدمات نمایاں نظر آتی ہیں۔ ۱۸۰۰ء میں فروغ اردو کے ذریعے فارسی کی پسماندگی کے حصول کے لیے قائم ہونے والے اس کالج نے انگریز سول افسران کو ہندی معاشرت اور

تہذیب سے واقف کرانے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے دامن کو وسیع کرنے کا کام سرانجام دیا۔ ترجمے کی سیاسی اہمیت فورٹ ولیم کالج کی صورت میں واضح نظر آتی ہے۔ میر امن دہلوی، للو لال جی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، کاظم علی جوان وغیرہ کالج کے منشی تھے جنھوں نے فارسی، سنسکرت اور عربی کے شاہکاروں کو اردو زبان کا لباس پہنا دیا۔ میں جان گلکرائسٹ نے اردو لغت شائع کی جو انگریزی ڈکشنری کا ترجمہ تھی۔ انگریزی کتب کے زیادہ تراجم انگریزوں ہی نے کیے اور ۱۹ویں صدی کے آغاز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۲۵ء میں اپنے قیام کے بعد سے دہلی کالج نے ترجمے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ترجمے کے اصول اور تکنیک کے سلسلے میں اس کالج نے پہلی بار چند اصول مرتب کرنے کی کوشش کی۔ دہلی کالج سے منسلک مترجمین کے علاوہ دیگر میں سدا سکھ لال اور نیم چند کھتری جیسے نام نمایاں ہیں۔

۱۸۶۲ء میں سر سید احمد خان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کی خدمات کے تذکرے کے بغیر برصغیر پاک و ہند میں اردو ترجمے کی تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے۔ سائنسی و غیر سائنسی کتب کے تراجم کے ذریعے اسی سوسائٹی نے برصغیر کے مسلمانوں کو ترقی کی دوڑ میں شامل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو ہند قائم کی گئی شبلی نعمانی اس کے اولین صدر نشین تھے جو ترجمے کو قومی شعور کی بیداری کے لیے نہایت اہم خیال کرتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد پڑی۔ یہاں زیادہ تر انگریزی زبان سے ناواقف عربی دان اصحاب نے عربی کے توسط سے تراجم کیے اس لیے ان کے ترجموں کی زبان بڑی تعداد میں عربی آمیز ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے باقاعدہ مترجمین کو بھرتی کیا اور زیادہ منظم طریقے سے کام کیا۔ اکادمی ہندوستان (۱۹۲۷ء) اور اکادمی اردو نے اردو میں تراجم کے لیے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد انگریزی سے اردو تراجم کا سلسلہ انفرادی اور اداروں کی سطح پر جاری رہا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان، نیشنل بک کونسل، اقبال اکادمی، اکادمی ادبیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، نیشنل بک فاؤنڈیشن اور مرکزی اردو بورڈ چند ایسے

ادارے ہیں جو اردو میں دیگر اہم زبانوں کی تصنیفات کے تراجم کے ذریعے اردو زبان کو مالا مال کر رہے ہیں۔

ترجمے کے نظریات

مغرب میں

جہاں تک ترجمے کے مختلف نظریات کا تعلق ہے یہ ترجمے کے عمل سے ہی جنم لیتے ہیں۔ مغرب میں تقریباً سبھی نظریات کو مختلف ادوار میں عملی طور پر برتا گیا جبکہ مشرق نے اپنی ضروریات اور استعداد کے مطابق ان میں سے چند ایک کو اپنایا۔ ان نظریات کی تخلیق میں کارفرما عوامل علمی، معاشرتی، سیاسی مذہبی اور خود ترجمے کے سابقہ نظریات اور عمل ہیں۔ چونکہ ترجمے کا عمل زیادہ تر ادبی ہے لہٰذا ادب میں رونما ہونے والی تحریکیں بھی ترجمے کے مختلف نظریات کے جنم کا باعث بنتی ہیں۔ ترجمے کے عمل کے دوران چونکہ مترجم کا واسطہ مختلف علوم و فنون اور ثقافتوں سے پڑتا ہے اور اس کا ذہنی افق وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ترجمے کا عمل متنوع اور کثیر الجہات ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ نظریہ فنِ ترجمہ کے بطن سے ہی جنم لیتا ہے۔ ترجمے کے مختلف نظریے دراصل ترجمے کے مختلف ادوار اور طریقوں کا تعین کرتے ہیں۔

سسرو (Cicero) سے لے کر ۱۷۹۱ء میں ٹیٹلر کی Essay on Principles of Translation کی اشاعت تک فنِ ترجمہ کے نظری اور عملی پہلو میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا جبکہ ۲۰ویں صدی کے وسط تک کے دور میں ترجمہ کی اصطلاحات اور طریقہ ہائے کار نے فروغ پایا۔ اس دور میں ترجمہ زیادہ تر تشریحی و توضیحی تھا اور خصوصاً اہمیت مقدس کتابوں کے ترجمے کو حاصل تھی۔ بیسویں صدی اور اس کے بعد کے تراجم کی تکنیک میں متن کی مابعد الطبیعیاتی تحقیق/توضیح ایک مرتبہ پھر مطمحِ نظر بن گئی کیونکہ لسانیات نے ترجمے کو نئی جہات سے آشنا کیا۔ میتھو آرنلڈ، ورڈز ورتھ، لانگ فیلو ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے ترجمے کو علمی وقار اور اعتبار

بخشا۔ ماخذ زبان کو ہدفی زبان پر برتری حاصل ہوگئی اور ترجمے کا مقصد ادبی سطح پر قاری کو اصل متن کی طرف راغب کرنا قرار پایا۔ لہٰذا ترجمے کی زبان کی غرابت کو ارادی طور پر پسند کیا گیا۔ ۲۰ویں صدی کے نصف اول تک ساختیات، نوتنقید اور ابلاغی نظریے کا فروغ عمل میں آیا اور ساتھ ہی لسانیات کا ترجمے پر اطلاق بھی شروع ہوگیا۔

رومن جیکوبسن نے ۱۹۵۹ء میں اپنے مقالے On lignuistic Aspects of Translation میں ترجمے اور لسانیات میں ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے نظریے کی بنیاد Saussar کے لسانی نظریات پر رکھی۔ جیکوبسن ترجمے کی تین اقسام قرار دیتا ہے یعنی:

۱۔ بین اللسانی

۲۔ بیرون اللسانی

۳۔ بین المعنیاتی

وہ ہم پلہ الفاظ کی فراہمی پر زور دیتا ہے اور یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ زبانوں میں ہم پلہ الفاظ مکمل طور پر دستیاب نہیں ہیں۔

یوجین نیڈا نے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے ساتویں دہائی تک نوم چومسکی کی لسانیاتی دریافتوں کو مدنظر رکھ کر اپنا نظریہ پیش کیا اس کی کتاب Towards a Science of Translating (1964) میں ترجمے کے معنیاتی اور نتائجی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ نیڈا کے نظریے کو Recepto based نظریہ کہا جاتا ہے اس نے معانی کو حوالہ جاتی، جذباتی اور لسانیاتی بنیادوں پر تقسیم کیا۔

نیڈا کے نظریے کو رد کرنے والوں میں پال نیو مارک سرفہرست ہے جس نے نیڈا کی پسندیدہ اصطلاحات ''رسمی'' اور کثیر الجہاتی'' کو ''معنیاتی'' اور ''ابلاغی معنیات'' سے تبدیل کر کے یہ دلیل دی کہ نیڈا کے نظریے پر عمل کرتے ہوئے زبانوں میں مساویت نہیں آتی اور ماخذ زبان اور ہدفی زبان میں ایک خلا رہ جاتا ہے۔ چنانچہ حیران کن طور پر وہ لفظ بلفظ ترجمے کی صلاح دیتا ہے تاکہ معنویاتی خلا نہ آنے پائے اور ابلاغ میں کوئی کمی یا کجی نہ رہ جائے۔

ورنر کولر (Werner Koller) چیسٹر مین، مونا بیکر اور سوسن بیسنٹ بھی مساویت کے قائل ہیں۔ کیٹ فورڈ، ونے اور ڈاربلنٹ بھی مساویت پر زور دیتے ہیں۔ ونے اور ڈاربلنٹ نے لفظی ترجمے میں محضر کے تجزیاتی رویے نے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں فروغ پایا۔ منڈ لے کے خیال میں زبان کے معنوی اور معاشرتی تعلق کو اہمیت حاصل ہے۔ ہالیڈے مصنف کے لسانی انتخاب کا ربط سماجی ثقافتی فریم ورک سے قائم کرتا ہے۔ ہالیڈے منڈے کا پیش کردہ ماڈل اپنی بات کی وضاحت کے لیے پیش کرتا ہے۔

Socio-cultural environment

|

Genre

|

Register

|

(feild, tenor, mode)

|

Discourse Semantics

|

(Ideational, Interpersonal, Tentual)

|

Lexicogrammar

transitivity, modality, rhyme, theme/cohesion[۲]

ایک اسرائیلی عالم زوہر نے ۷۰ کی دہائی میں ترجمہ شدہ ادب کو نہ صرف ایک مجموعی ادبی

نظام کا حصہ قرار دیا بلکہ اس نظام میں سب سے زیادہ فعال ترین نظام بھی کہا۔ ادب کوئی تنہا وحدت نہیں ہے بلکہ یہ ایک پورے ادبی نظام کا اثر پذیر اور تاثر پذیر محرک حصہ ہے۔ اس پر اثر انداز ہونے اور اس سے اثر قبول کرنے والے اثرات معاشرتی، ادبی، ثقافتی اور تاریخی پہلو کے حامل ہیں۔ اور آزاد ترجمے کی بحث کو راست بمقابلہ آڑا ترجمہ کے عنوان سے دوبارہ شروع کیا۔

۱۹۶۰ء سے ۷۰ تک کی دہائی میں چیکوسلواکیہ کے مترجمین نے پہلی بار اپنی توجہ متن کے اسلوب کی طرف منتقل کی۔ جیری لیوائی Jiri Levy ترجمے کو باز تخلیق اور تخلیقی کاوش قرار دیتا ہے کیونکہ مساوی حسین تناسب کا خیال رکھنا مترجم کی ذمہ داری ہے اور اگر چہ وہ معنیاتی اور لسانی سطح پر اتنا مصروف عمل نہیں ہوتا مگر اس کا میدان نتائجی اعتبار سے بہت بڑھ جاتا ہے کیونکہ اسے زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنا ہوگا۔ لیوائی اس کو Miniman حکمت عملی کہتا ہے۔[۳]

ایمسٹرڈیم کی Kitty Van Leuven Zwart نے ترجمے میں ماخذ زبان اور ہدفی زبان کے مابین تقابلی ماڈل پیش کر کے شفٹ کے تجزیے پر زور دیا۔ اس کی توجہ کا مرکز مطلوبہ کلچر ہوتا ہے۔ اس نظریے میں ایک خامی یہ ہے کہ ترجمے کے عمل کے دوران ہر شفٹ کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

متن کی سطح پر ابلاغ کا تصور جرمنی کی (Katarina Reiss) نے پیش کیا۔ ۱۹۷۰ کی دہائی میں انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ متن کے تین وظائف ہوتے ہیں۔ یعنی معلوماتی، ترجمانی اور عملیاتی، ہر متن کا ترجمہ اس کے وظیفے کے مطابق کیا جانا چاہیے کہ سٹیانا نورڈ نے ان وظائف میں ابلاغ میں شامل گروہوں کے درمیان لسانی روابط کی استواری کا اضافہ کیا۔ نورڈ نے Tent Analysis in Translation 1988 میں ترجمے کے عمل کو دو اقسام میں تقسیم کیا۔ یعنی دستاویزی اور آلاتی۔ دستاویزی ترجمے سے مراد ادبی تراجم ہیں جہاں قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ پڑھ رہا ہے جبکہ آلاتی ترجمہ میں کمپیوٹر چلانے کے سافٹ ویئر کا

ترجمہ کرنا ہے۔

ادب کے اس مجموعی نظام میں مقام کی بدولت ہی ترجمہ شدہ ادب کی حیثیت بنیادی یا ثانوی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔اسی مقام کی بدولت ترجمے کی حکمت عملی کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اگر ادب کی اہمیت بنیادی نوعیت کی ہے تو مترجم اپنی زبان کی مروجہ حد بندیوں کو توڑتا اور ایک نئی ماخذ زبان کا تجربہ کرتا ہے تاہم اگر یہ اہمیت ثانوی نوعیت کی ہو تو مترجم ترجمے کے لیے ہدفی متن کے مروجہ معیارات ہی کو مدنظر رکھتا ہے۔

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کا ترجمے کے متعلق نظریات پر بھی اثر پڑا ہے۔ اور مابعد نوآبادیاتی نظریہ ترجمہ کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے میں ترجمے کا فعال کردار رہا ہے۔ ترجمے اور ثقافت کے تعلق کو آندرے لیفیور سوسن بیسنٹ اور ولادیمیر آئیور نے کافی اہمیت دی ہے۔

آئیور کے خیال میں عمل ترجمہ سے مراد السنہ نہیں بلکہ ثقافتوں کا ترجمہ ہے (ivir 35) حالانکہ زبان اور ثقافت کو الگ نہیں کہا جا سکتا ثقافتی امتیازات اور مشترکات کو سمجھے بغیر موثر ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ سوسن بیسنٹ اور لیفیور نے ترجمے میں بازتحریر کے عمل کو ایک ثقافت کے زیر اثر دوسری ثقافت کی تشکیل قرار دیا ہے۔اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ایک زبان کے زیر اثر دوسری زبان میں الفاظ، اصناف اور تصورات متعارف ہو سکتے ہیں۔ تعارف کا یہ عمل دوطرفہ بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر انگریزی نے اردو زبان کو ناول، افسانہ، نظم معری وغیرہ سے متعارف کروایا تو جواب آں غزل کے طور پر انگریزی میں ترجمہ ہونے والے اردو طرز اظہار اور اصناف سے متعارف بھی ہوئی۔

جارج سٹینر (George Steiner) نے مترجم کی اپنی فہم کے مطابق اور خود کو مصنف کی جگہ تصور کر کے متن کو سمجھنے کی کوشش کا نظریہ پیش کیا۔ مترجم کو متن کے اولین قاری اور باز مصنف کی حیثیت سے دوہری برتری حاصل ہوئی ہے اور ترجمہ مترجم کی اس فہم کی عکاسی قرار پاتا ہے۔ والٹر بنجمن نے زبانوں کے اشتراکات اور بنیادی طور پر آپس میں مربوط ہونے پر

زور دیا اور ترجمے کو اس ربط اور اشتراک کے اظہار کا اہم وسیلہ قرار دیا۔ یعنی اگر ایک زبان کی تحریر دوسری زبان میں ترجمہ ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ زبانیں بہت سے اشتراکات کی حامل ہیں۔

اردو میں

برصغیر میں مستعمل فن ترجمہ کے نظریات پر ایک نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ اس خطے میں نظریہ ہائے فن ترجمہ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ ترجمے کے عمل کا تجزیہ کیا جائے تو یہ محض ابتدائی سطح کی سرگرمی ہے جس کا مقصد محض اردو لغت میں اضافہ اور اصل مصنف سے وفاداری ہے تاکہ اس کا خیال اردو قارئین تک بعینہٖ پہنچایا جا سکے۔ اس سلسلے میں اردو میں موجود کتب کا ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

اردو میں فن ترجمہ سے متعلق دستیاب کتب میں اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے سرفہرست کتاب اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، روودادِ سیمینار ہے جسے اعجاز راہی نے مرتب کیا ہے۔ یہ سیمینار مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا جس میں ادبی فنی و سائنسی، علمی اور صحافتی ترجمے کے متعلق مضامین پڑھے گئے۔ ادبی ترجمے کے متعلق پانچ مقالے پڑھے گئے جن میں کوئی نیا خیال نظریہ، یا طریقہ نہیں بتایا گیا۔ ترجمے کے مسائل اور اردو جملے کی کجیوں کو زیر بحث تو لایا گیا ہے مگر کوئی عملی حل پیش نہیں کیا گیا۔ ترجمے کے فن پر یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں طبع ہوئی اس سلسلے کی طبع شدہ کتب میں سے ایک اور کتاب خلیق انجم کی ''فن ترجمہ نگاری'' ہے۔ اس کتاب میں کل بارہ مقالات ہیں جن کا موضوع فن ترجمہ کی اہمیت اور تاریخ ہے۔ تاریخ پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔

نثار احمد قریشی کی مرتب کردہ کتاب ''ترجمہ، روایت اور فن'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی اس کتاب کے چودہ مضامین میں سے دو ترجمے کی اہمیت پر جبکہ پانچ اصولِ ترجمہ سے متعلق ہیں۔ اس سے اگلا موضوع ترجمے کے مسائل ہے مگر اس میں بھی لغات کی عدم موجودگی یا کمی،

مختلف اصناف ادب کے لیے بہتر حکمت عملی اور ترجمے کی اقسام کے علاوہ زبانوں کے اختلاف پر بات کی گئی ہے۔ کوئی بھی صاحب مضمون ترجمے کا کوئی نظریہ پیش نہیں کرتا۔ یہ کتاب بھی ترجمہ سے متعلق کسی اور شعبہ ہائے علم و ادب پر بات نہیں کرتی۔

ڈاکٹر قمر رئیس کی کتاب ''ترجمے کا فن اور روایت'' ہے۔ ۱۹۷۶ء میں طبع ہونے والی یہ کتاب بھارت سے شائع ہوئی اور اٹھارہ مقالات پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے مضمون نگاروں میں وحید الدین سلیم، پروفیسر آلِ احمد سرور، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، جمیل جالبی، نظیر احمد، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، سید احتشام حسین، تھیوڈور سلوری، آصفہ جمیل، شہباز حسین، میر حسن، سید ضمیر حسن، ڈاکٹر امیر عارفی اور ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر اصغر عباس، ڈاکٹر اطہر پرویز اور عبدالقادر سروری شامل ہیں۔ اس کتاب میں برصغیر میں اردو ترجمے کی تاریخ اور اس حوالے سے مختلف اداروں کا کردار زیرِ بحث لایا گیا ہے اور اس سلسلے میں عثمانیہ دارالترجمہ، دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹۸۷ء میں شائع ہونے والی ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی کتاب ''ترجمہ کا فن'' دو نکات پر زور دیتی ہے یعنی ترجمہ شدہ کتب سے ترجمہ کرنے والے مترجمین پر تنقید اور آزاد ترجمے پر کڑی نگاہ۔ بعض اوقات آزاد ترجمے سے پیدا ہونے والی مضحکہ خیز صورتِ حال پر تنقید مرزا حامد بیگ کی اس کتاب کا موضوع ہے۔

ادارۂ فروغِ قومی زبان، پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی ڈاکٹر صوبیہ سلیم اور محمد صفدر رشید کی مرتبہ کتاب "فنِ ترجمہ کاری" (مباحث) ۲۰۱۲ء میں سامنے آئی۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پرانے مضامین کے علاوہ نئے مضامین اور موضوعات کو شامل کیا گیا ہے۔ ان میں " ترجمہ اور لسانیات، اردو میں ترجمہ کاری کی تربیت، ترجمے کا فن، ہومز کے نقشے کی نظر سے، جامعات میں تدریسِ ترجمہ: نیا تناظر، فطری سائنس کی اصطلاحات کے مسائل، مشینی ترجمے کی سہولیات، اور مشینی ترجمہ کاری کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ آداب و مسائل جیسے مضامین کا حوالہ قابلِ ذکر ہے۔

۲۰۱۳ء میں خالد اقبال کی کتاب فنِ ترجمہ اصول و مبادیات جھوک پبلشرز، ملتان کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ یہ کتاب طبع زاد ہونے کے باوجود محض روایتی مضامین مثلاً ترجمہ کیا ہے، ترجمے کی اہمیت و مشکلات، ترجمے کی اقسام اور مترجم کے فرائض کے علاوہ ترجمے اور لسانیات کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ انگریزی سے منقول اقتباسات کی بھر مار اور انکی وضاحت کر کے انھیں اردو کے قاری کے لئے پڑھنے اور سمجھنے کی چیز بنانے کے بجائے مصنف نے قاری کو فعال ہونے کی دعوت دی اور مترجمین کی ازلی سستی کو بھی مات دے دی۔

اس مختصر جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں فن ترجمہ کے نظریات پر کوئی ایسا کام نہیں ہوا جو محض تصوراتی اور خالی خولی منطق سے ہٹ کر باقاعدہ کسی نظریے کے تحت کیا گیا ہو۔ یہی جائزہ فن ترجمہ کے نظری مباحث پر مبنی کام کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس سلسلے میں تحقیقی کام کا تقاضا بھی کرتا ہے۔

پوری دنیا میں ترجمے کے لیے مختلف طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ تمام طریقے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ترجمے کے لیے کوئی ایک طریقہ انفرادی طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ عمل مختلف طریقوں کے ملاپ سے مکمل ہوتا ہے۔ تاہم طریقہ کار کے انتخاب کا انحصار بڑی حد تک متن کی نوعیت اور مؤکل کی ضرورت کے تقاضے پر ہوتا ہے۔ مآخذ زبان اور ثقافت پر توجہ مبذول کرنے کے بجائے قارئین اور مدنظر ثقافت پر توجہ ضروری سمجھی جانے لگی ہے۔ اسی نکتے کے پیش نظر مترجم کسی متن کا انتخاب کرتا ہے۔ سسرو اور ہوریس کے زمانے ہی سے معاشرے کی علمی و ذہنی ترقی کے لیے ترجمہ کی اہمیت مسلم رہی ہے۔ چنانچہ ترجمہ شدہ متن کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ سوائے اس کے کہ ترجمے کا مقصد ہی کسی متن میں تحریف کر کے یا اسے توڑ مروڑ کر پیش کرنا ہو۔

انگریزی زبان میں طبع زاد اور ترجمہ شدہ علم و ادب کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ اردو کی نسبت قدیم ادبی روایت اور اخذ و استفادہ کی مضبوط روایت کی بدولت انگریزی زبان مالا مال اور دوسری زبانوں کی نسبت ترقی یافتہ ہے۔ اس زبان سے ترجمہ کرنے والے عموماً اور خصوصاً

اردو میں ترجمہ کی صورت میں مترجم کو مداری کی سی مہارت اور جادوگری کا حامل ہونا چاہیے۔

برصغیر پر انگریز راج کی بدولت انگریزی تمدن اور ثقافت سے بہت حد تک آشنا ہونے کے باوجود مترجم کو کافی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ دیسی بوباس سے قریب تر رکھنے اور اصل سے وفاداری کے اس ہمہ وقت متضاد عمل میں وہ لندن کے گلی کوچوں کے تمدن کو لاہور یا سیالکوٹ کے تمدن میں تبدیل نہ کر جائے۔ یہ خطرہ مترجم کے سر پر لٹکتی تلوار کی مانند ہے۔ترجمے کا عمل محض طریقہ ہائے ترجمہ کی اطلاقی شکل ہی نہیں ہے بلکہ بدلتے ہوئے معاشی ومعاشرتی، سیاسی وثقافتی منظر نامے میں اس کو اپنی تشکیل نو بھی کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمے کا عمل متحرک ہے ساکن یا جامد نہیں۔کوئی بھی ترجمہ حتمی یا آخری قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حوالہ جات

۱۔مرزا حامد بیگ ،ڈاکٹر ،مغرب سے نثری تراجم ،مقتدرہ قومی زبان ،اسلام آباد ۱۹۸۸ء ص ۸۶

2. Munday ,Jeremy,"IntroducingTranslation Studies,RoutledgeOxan,2001,p.89

3. Munday ,Jeremy,Introducing Translation Studies,p.62

باب چہارم

بین المتنیت اور ترجمہ

○

بین المتنیت کی اصطلاح ایک فرانسیسی ماہرِ لسانیات جولیا کرسٹیوا سے آئی۔ بین المتنیت ایک متن کے اندر دوسرے متن کی موجودگی ہے۔ یہ موجودگی ترکیب، صورتِ حال، جملے، اقتباس اور تاثر کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے اور کسی دوسرے میڈیم آف آرٹ کی لفظی عکاسی کی شکل بھی اختیار کرسکتی ہے۔مثلاً کسی ناول میں کسی مجسمے یا تصویر کی لفظی صورت گری،فلم ڈرامے یا گیت کا حوالہ،نظم یا شعر کا تذکرہ، یہ سب بین المتنیت کی مختلف صورتیں ہیں۔اسکی مثالوں میں انگریزی کے نامور شاعر کیٹس کی شہرہ آفاق نظم "Ode On a Grecian Urn"، اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ، جان ملٹن کی فردوسِ گم گشتہ،ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ وغیرہ شامل ہیں۔

اردو میں چونکہ یہ اصطلاح نہ ہونے کی حد تک مستعمل ہے اور ترجمے کے نظری مباحث پر موجود کتب اس سے قطعی نا آشنا ہیں ،لہٰذا اس باب میں راقمہ نے انگریزی زبان سے تین مضامین کی مدد لی ہے، ان مضامین کی مدد سے بین المتنیت کی مختلف اقسام اور اشکال، بین

المتنیت کے وظائف اور اثرات، ترجمے کے مسائل اور انکے حل کی حکمتِ عملیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ان مضامین میں

1. Translation and Discourse by Tim Ennis

2-"Intertextuality in Literature,Film, and other popular Media:Intermediality and signs relation" by Stephen Awung

3-"What is intertextuality" by Tracy Lemaster

شامل ہیں۔اس موضوع پر پڑھتے ہوئے راقمہ کو اس نظریے میں ٹی ایس ایلیٹ کے مضمون "Tradition and Individual Talent" اور اسرائیلی عالم زوہر کی پولی سسٹم تھیوری کی جھلک محسوس ہوئی۔ لہٰذا زوہر کی کتاب 'Poly System Studies" سے استفادے کا موقع بھی ملا۔اس باب میں ان دو ناقدین سے بھی خوشہ چینی کی گئی ہے تاکہ راقمہ اپنی بات کی وضاحت بہتر طریقے سے کر سکے۔

بین المتنیت کی تعریف اور تعارف

بین المتنیت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ان تعریفوں کو آسان زبان میں یوں تحریر کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بین المتنیت کسی بھی ادبی،فنی یا ہو سماجی متن میں کسی دوسرے ادبی،فنی یا سماجی متن کی موجودگی یا اسکی موجودگی کا اشارہ ہے۔گویا کسی کتاب میں دوسری کتاب،میڈیا،یا سماجی کتاب کا حوالہ،کتاب کا عنوان،اقتباس،یا محض اس کی طرف اشارہ بین المتنیت کہلائے گا۔یہ کتاب،فلم،ڈرامہ،سماجی واقعہ اس زبان اور معاشرے کا بھی ہوسکتا ہے اور کسی دوسرے ملک،زبان یا سماج سے بھی لیا جا سکتا ہے۔

۲۔ کوئی بھی متن دوسرے متون کے اقتباسات،اقوال یا حوالوں کو ترتیب دے کر یا انکے انجذاب کے بعد وجود میں آتا ہے۔یہ انجذاب دو صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اولا

پہلے سے موجود حقیقت یا خیال کی حقیقی یا متنی صورت کی نقل کی جاتی ہے ۔یعنی پہلے سے موجود اور مستحکم خیالات اور نظریات کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ثانیا،اقوال یا اقتباسات کی شکل میں پہلے سے موجود خیالات وافکار کو متن میں بعینہ نقل کر دیا جاتا ہے۔بعض متون میں اقتباسات کو واوین میں درج کر کے انکی علیحدہ شناخت کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور بعض اوقات واوین نہیں لگائے جاتے جسکی بناء پر قاری اگر پہلے سے واقف نہ ہوتو اقتباسات کو بھی متن کا حصہ ہی سمجھنے لگتا ہے۔

۳۔ متن دراصل کسی مصنف کے دائرہ علم اور مشاہدے میں اسکے اپنے تصورات کی آمیزش سے وجود میں آتا ہے۔مصنف کوئی ایسی چیز یا بات تحریر نہیں کرسکتا جو اس نے پہلے سے پڑھی،دیکھی،سنی یا مشاہدہ نہ کی ہو۔ ہر متن میں اپنے سے پہلے کے متون کی بازگشت اور اپنے بعد آنے والے متون کی جہات پوشیدہ ہوتی ہیں ۔کسی متن کی مکمل تفہیم کے لئے اس میں موجود تمام حوالوں کی تفہیم ضروری ہے۔ایسا نہ ہونے کی صورت میں متن کی جزوی تفہیم ہو پائے گی۔

ان تعریفوں کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متن کی مکمل تفہیم قاری کے لئے بھی اتنی آسان ،پھر مترجم جو نہ صرف متن کا قاری بلکہ اسکا باز تخلیق کار بھی ہوتا ہے اسکے لئے متن کے اندر موجود متون کو پہچاننا اور انکی تفہیم کے بعد ترجمے میں کامیابی سے منتقل کرنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔اس باب کے آغاز میں راقمہ نے ٹی ایس ایلیٹ اور زوہر کے پولی سسٹم کا تذکرہ کیا تھا،بین المتنیت کی تعریفوں کو پڑھتے ہوئے یقیناً ان دو ناقدین کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔
ٹی ایس ایلیٹ کے نظریہ روایت کے مطابق ناقدین کسی شاعر کے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے اپنی پوری طاقت اسکی انفرادیت اور ایسے پہلوؤں کی تلاش میں صرف کرتے ہیں جو اسے اپنے پیش رووں اور خصوصا ہم عصروں سے ممتاز قرار دے سکیں۔ناقدین مصنف کی اپنی شخصیت اور انفرادیت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ٹی ایس ایلیٹ کے نزدیک یہ ایک تعصب ہے اور اس سے نجات حاصل کر کے دیکھیں تو کسی شاعر کی فنی پختگی کے دور کی تحریروں

میں سب سے زیادہ اسکے پیش روؤں کی جھلک نظر آتی ہے۔اس اصول کا اطلاق اسکی تحریر کے ان حصوں پر خاص طور پر کیا جا سکتا ہے جس کو ناقدین اسکی انفرادیت قرار دے رہے ہوں۔1
اسی مضمون میں آگے چل کر ٹی ایس ایلیٹ لکھتے ہیں ''کسی شاعر،کسی بھی فن سے متعلق فنکار کے تنہا اپنے کوئی معانی نہیں ہوتے۔اسکی اہمیت،اسکی ستائش مردہ شاعروں اور فنکاروں سے اس کے تعلق کی ستائش ہوتی ہے۔اسکی قدر پیمائی تنہا نہیں کی جا سکتی؛آپکو موازنے اور مقابلے کے لئے اسے مرحومین کے درمیان رکھنا پڑے گا۔''[۲]

گویا کسی بھی مصنف شاعر یا نکار کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے معاصرین اور پیش روؤں سے الگ راہ نکال سکے۔اس ضمن میں ہم اس بچے کو یاد کر سکتے ہیں جو باپ کے کندھوں پر بیٹھ کر میلہ دیکھنے جاتا ہے۔اسکے قد کی لمبائی میں اسکے والد کے قد کی لمبائی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔لہٰذا کسی متن کی خوانی میں یہ امر ذہن سے نہیں نکلنا چاہئے کہ اس میں موجود دیگر متون کی مختلف صورتیں پہچانی جائیں۔مترجم کی مشکلات اور کسی متن کے ناقابلِ ترجمہ ہونے کے امکانات بین المتنیت کی بدولت بڑھ جاتے ہیں۔

زوہر کے پولی سسٹم کے مطابق ادب کوئی تنہا وحدت نہیں ہے بلکہ یہ ایک پورے ادبی نظام کا اثر پذیر اور تاثر پذیر محرک حصہ ہے۔اس پر اثر انداز ہونے اور اس سے اثر قبول کرنے والے اثرات معاشرتی،ادبی،ثقافتی اور تاریخی پہلو کے حامل ہیں۔ادب نہ تو کسی خلا میں تخلیق ہوتا ہے نہ مصنف اپنے گردوپیش سے بیگانہ رہ سکتا ہے۔جب ہم کسی متن کی علاقائیت اور عالمگیریت پر بات کرتے ہیں تو ہماری مراد یہی علائق اور اثرات ہوتے ہیں۔ادبی سطح پر دخل اندازی ادبی تاریخ کا حصہ رہی ہے۔کسی مقام پر بھی دخل اندازی کو روکا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ ایک غیر ارادی اور غیر شعوری عمل ہے۔خود مصنف آگاہ نہیں ہو پاتا کہ ادبی تاریخ یا اسکا پڑھا ہوا ادب کیسے اسکی تحریر کا حصہ بن جاتا ہے۔ادبی دخل اندازی سے زوہر کی مراد کوئی سے دو ادب کے مابین تعلق ہے۔ترجمہ خاص طور پر اس دخل اندازی کا فعال حصہ ہے۔[۳]
بین المتنیت کی نوعیت کو ادب سمجھ لینے کے بعد ضروری ہے کہ اسکی اقسام پر تھوڑی روشنی

ڈالی جائے۔

بین المتنیت کی اقسام

بین المتنیت کی دو اقسام یا صورتیں ہیں۔(۴)

۱۔افقی یا عمودی بین المتنیت

۲۔ بین یا ترکیبی بین المتنیت

ان دونوں اقسام کے لئے اگرچہ مختلف اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں لیکن ان کی نوعیت یا معانی میں فرق نہیں تھا ،دیگر اصطلاحات سے مراد بھی یہی اقسام یا صورتیں تھیں لہٰذا میں نے یہ اصطلاحات ٹم اینس (Tim Ennis) سے مستعار لے لیں ۔ان اقسام کی مزید تفصیل درجِ ذیل ہے۔

۱۔افقی یا عمودی بین المتنیت

کسی متن میں دوسرے متن کی واضح موجودگی جسے سمجھنے کے لئے زیادہ غوروفکر کی ضرورت نہ ہو۔یہ کسی کتاب سے متاثر ہوکر اسکے تسلسل کے طور پر لکھی گئی ،یا کسی کتاب کے جواب میں اسکے رد یا تصحیح واعتراض کے لئے لکھی گئی کتاب ہوسکتی ہے۔عموماً یہ اکادمیاتی یا تحقیقی وتنقیدی کتب کی صورت میں ہوتا ہے۔مرزا غالب کی قاطع برہان ،اورسرسید احمد خان کے خطباتِ احمدیہ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔کسی ایک ادبی متن میں کسی دوسری کتاب یا ادبی متن کا مختصر یا تفصیلی ذکر اور حوالہ بین المتنیت کی عمودی شکل ہے جبکہ کسی متن کے کسی ایک حصے،منظر یا کہانی کا خلاصہ بیان کرنا افقی صورت ہے۔

۲۔ بین یا ترکیبی بین المتنیت

کسی ادبی متن میں دوسرے ادبی متن کے اقتباسات اور اقوال کا نقل کیا جانا اس امر کا

اعتراف ہے کہ مصنف نے دوسرے متن سے واضح استفادہ کیا ہے۔لہٰذا یہ ایک متن میں دوسرے متن کی موجودگی اور دخل اندازی کی وہ صورت ہے جس میں عموما مصنف واوین کے ذریعے قاری پر واضح کر دیتا ہے کہ اس نے کہاں سے خوشہ چینی کی ہے۔یہ صورت اپنے پیش رووٴں کی موجودگی کو قبول کرنے کی شعوری کوشش بھی ہے اور انکی دخل اندازی کے ناگزیر ہونے کا اعتراف بھی۔

متن میں ترکیبی بین المتنیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ زبان اور ادب میں روایت کے تصور کو سامنے رکھا جائے۔ ہر مصنف اور ادیب اس ادبی اور لسانی روایت کا خوشہ چین ہوتا ہے۔ترکیب سازی ہو یا خیالات و افکار میں جدت کا معاملہ،روایت کے حوالے اور سہارے کے بغیر وہ تن تنہا کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بین المتنیت کے وظائف کیا ہیں؟Tracy Lemaster نے ان وظائف کو تین نکات کے تحت بیان کیا ہے۔[۵]

ا۔موازنہ

بین المتنیت ایک متن کے اندر دوسرے متن کی واضح موجودگی کی صورت میں بنیادی اور ثانوی متن کے درمیان موازنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ثانوی متن کو اصل شکل میں پڑھ کر قاری یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ بنیادی متن کے مصنف نے متن کو کس حد تک اصل شکل میں پیش کیا یا اس میں کیا کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ بین المتنیت اپنی نوعیت کے اعتبار سے دومتون میں مقابلے اور موازنے کا ذریعہ بنتی ہے۔اس موازنے اور مقابلے سے دومتون میں اشتراکات اور اختلافات متعین کئے جاسکتے ہیں۔

۲۔مکالمہ

بین المتنیت دومتون کے مابین مکالمہ بھی ہے کیونکہ دونوں متون اپنی انفرادی حیثیت میں بنیادی متن ہوتے ہیں۔ چونکہ ایک متن میں دوسرے متن کا حوالہ کسی اشتراک یا اختلاف

کی صورت میں دیا جاتا ہے لہٰذا دونوں متون کا بیانیہ باہم کلام کرتا ہے۔دونوں بیانیوں کے اختلاف کی صورت میں قاری کے پاس دونوں میں سے بہتر یا برتر بیانیے کی تلاش کا موقع ہوتا ہے۔یوں دومتن ایک دوسرے سے اختلافی مکالمہ کرتے ہیں۔

۳۔عدم استحکام

قاری اگر ثانوی متن سے واقف ہو اور اسکی تفہیم پہلے سے موجود ہو،تو ممکن ہے بین المتنیت اسکی اس تفہیم کو عدم استحکام کا شکار کر دے۔ممکن ہے جس متن کو قاری نے محض سطحی اور سپاٹ بیانیے کی شکل میں پڑھا ہو وہ ایک اعلیٰ درجے کی علامتی حیثیت میں سامنے آئے۔بین المتنیت کی صورت میں متن کی پرانی تفہیم میں تبدیلی یا اس میں وسعت آجاتی ہے۔بعض اوقات بنیادی متن میں جاری بیانیہ اس دوسرے متن کی دخل اندازی کی بدولت متاثر ہوتا ہے اور اس کی تفہیم آسان نہیں رہتی۔

بین المتنیت ،یعنی متن میں دوسرے متن کی آمد اور اور موجودگی کی تعریف اور وظائف کے تعین کے بعد اب ضروری ہے کہ ترجمے کے عمل میں بین المتنیت کی بدولت حائل مشکلات کا جائزہ لیا جائے۔

بین المتنیت اور ترجمے کی مشکلات

اس کتاب میں راقمہ نے قاری کی اہمیت پر بارہا بات کی ہے لہٰذا اس کو بار بار دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ترجمے کا مقصد قاری کی تفہیم بھی ہے اور بین المتنیت اصل متن کی تفہیم میں بھی مشکل پیدا کرتی ہے۔ضروری نہیں کہ ماخذ زبان کا قاری بھی متن میں بین المتنیت کی ہر صورت کو پہچانتا اور سمجھتا ہو۔ہدفی زبان کے قاری کے لئے متن کے اندر موجود متون کو پہچاننا اور انکی تفہیم کے قابل ہوسکنا بہت ضروری ہے۔یہاں آکر مترجم کو لسانی مسائل کے ساتھ ساتھ تہذیبی مسائل سے بھی عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔اس موقع پر مساویت کی تکنیک بھی استعمال

کی جا سکتی ہے لیکن اگر ثقافتی اور تہذیبی فرق بہت زیادہ ہو گا تو مساویت ممکن نہیں ہو پائے گی۔

مترجم کی حکمتِ عملی

بین المتنیت سے پیدا ہونے والی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مونا بیکر نے پانچ حکمت عملیاں بتائی ہیں۔[6]

۱۔ لغوی ترجمہ

۲۔ ثقافتی متبادل کی فراہمی

۳۔ متن یا حاشیے میں وضاحت

۴۔ تخریج (omission)

۵۔ اصل زبان کے اظہارات کی ترجمے میں منتقلی

ان تمام حکمت عملیوں پر عمل کے بعد بھی یہ ممکن ہے کہ ترجمہ ہونے والا متن اصل سے اتنا دور جا پڑے کہ خود مصنف کے لئے پہچاننا مشکل ہو جائے۔ نیز ہر مترجم کے لئے اس درجے کی علمی و ذہنی مشقت ممکن بھی نہیں۔ مترجم اگر پیشہ ور ہے تو اسکی روزی روٹی ترجمے کے ساتھ جڑی ہے۔ مترجمین کا عمومی مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ پیشہ ورانہ سطح پر کام کریں تو گھنٹوں بیٹھ کر ایک اظہار اور طرزِ اظہار کو منتقل کرنے اور متبادل ڈھونڈنے کی سعی نہیں کریں گے کیونکہ ایک قابلِ خوانی، رواں اور آسان اسلوب کا حامل متن تیار کرنا انکا مقصد ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ قاری کی سہولت اور ظاہر ہے خود قاری کی اپنی سہولت کے لئے ہوتا ہے۔ ایسے تراجم محض پیسہ کمانے کا ذریعہ اور قاری کی گمراہی کا سبب بن جاتے ہیں۔

حوالہ جات

1. Eliot,T.S,"Tradition and Individual Talent",Perspecta Vol.19 p.36

2. Eliot p .37

3 .Zohar,Evan Itemar,"Polysystem Studies" Poetics Today 1990,p 53-70

4.Ennis,Tim,"Translation and Discourse", M.A Translation Studies,Question 5,p.3

5.Lemaster,Tracy,"What is "Intertextuality"?",Great World Texts:A Programm of the Center for the Humanities,University of Wisconsin,2012, p.1

6.Baker,Mona," In Other Words:A Coursebook on Translation",London:Routledge,p.71-77 and 228-243

ترجمے پر اثر انداز ہونے والے عوامل

○

ترجمہ ہونے والا متن ایک طرح سے مترجم ہی کی تصنیف ہوتا ہے کیونکہ متن کے ترجمہ کرنے والی زبان میں اس متن کو کسی تناظر میں پیش کرنے سے لے کر اصل متن کے ان پہلوؤں کے انتخاب تک میں مترجم کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ جن کو وہ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ یہ معاملہ ہر طرح کے ترجمے میں درپیش ہوتا ہے کیونکہ مترجم اپنی مرضی اور خواہش کے علاوہ اپنے ذوق اور سطح علمی کے ماتحت بھی ہوتا ہے۔ مترجم کا یہ فعال اور کلیدی کردار ترجمے کو دست کاری کا عمل (an act of manipulation) بنا دیتا ہے۔ لفظ Manipulation ایک مبہم لفظ ہے جو مترجم کے کام کی مختلف جہات کی طرف اشارہ کرتا ہے اس میں زیر سطح معانی کی جو لہریں سامنے آتی ہیں وہ مثبت بھی ہیں اور منفی بھی۔ قومی انگریزی اردو لغت میں اس کے معانی کچھ یوں درج ہیں:

> سلیقے سے برتنا۔ خوش اسلوبی سے انجام دینا، ہنرمندی سے کرنا۔ خوبی سے نپٹانا۔ سلجھانا۔ بحث کرنا۔ چالاکی یا ناجائز اثر ڈال کر کام نکالنا

(اپنے لیے) راہ ہموار کرنا۔ ساز باز کرنا۔ جوڑ توڑ کرنا۔ مالی گوشوارے میں ردوبدل کرنا کہ اس سے مطلوبہ فوائد حاصل ہوسکیں۔ دھاندلی کرنا۔ ہوشیاری سے مطلب نکالنا۔ نپٹانا۔ انجام دینا۔ چلانا۔ کام میں لانا۔ چال چلنا۔ اپنے مطلب کا بنالینا۔ بے ایمانی سے ادل بدل کرنا۔ بے ایمانی کرنا۔ دست کاری کرنا۔ کسی چیز کو سلیقے سے استعمال کرنا یا برتنا"[1]

مندرجہ بالا تمام معانی کو دیکھنے سے ترجمے کے عمل میں درپیش مختلف مسائل، عوامل اور مترجم کے کردار کی مختلف جہات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہمہ جہتی مترجم کے کردار کو زبان اور ادبی نظام سے کہیں زیادہ فعال ثابت کرتی ہے۔ مترجم کی خدمات کا اعتراف چاہے کیا جائے یا دوسرے درجے کا ذہنی مزدور قرار دے کر حقارت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اصل متن سے زیادہ مترجم کی دست کاری اور بُنت کے ساتھ ساتھ مہارت کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

ترجمہ زبان اور ثقافت، دو سطحوں کی قربت یا دوری کی بنا پر ہوتا ہے۔ یعنی ترجمہ ضروری نہیں بلکہ ایک بالکل مختلف ثقافت سے کیا جائے اور بالکل اجنبی زبان سے ہو۔ یا یہ کہ مماثل اور جغرافیائی ولسانی قربت کی حامل زبانیں ترجمہ نہیں کرسکتیں۔ مختلف علاقوں کے لوگوں میں زبان، فکر اور ثقافت کی مماثلت ہوسکتی ہے اور اس کی وجہ جغرافیائی، تاریخی اور مذہبی قربت ومماثلت ہوسکتی ہے۔ اس مماثلت کی واضح مثال اردو ہندی اور اردو فارسی ہیں۔ ترجمے میں درپیش لسانی وثقافتی تعلق کو یوجین نیڈا نے تین اقسام میں تقسیم کیا ہے۔[2]

۱۔ اصل متن اور ترجمے کی زبان اور ثقافت بہت حد تک قربت کی حامل ہوں۔

۲۔ ترجمے کی دونوں زبانیں الگ مگر ثقافتیں مماثل ہوں۔

۳۔ ترجمے کی زبان اور ثقافت دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔

چونکہ یہ کتاب زیادہ تر انگریزی اور اردو زبان سے بحث کرتی ہے لہٰذا تیسری صورت ان دونوں زبانوں کے عین مطابق ہے جو نہ صرف لسانی خاندانوں بلکہ ثقافت کے لحاظ سے بھی

ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ ثقافت ایک جبکہ زبانیں الگ ہوں تو مترجم کو ترجمے کے عمل میں کافی حد تک ایک سے دوسری منتقلی (shift) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم ثقافت کی مماثلت کی بنیاد پر متن کا معتد بہ حصہ مساوی اور متبادل الفاظ میں ترجمہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ زبان اور ثقافت دونوں کے اختلاف کی صورت میں درپیش مسائل سے کہیں کم سطح کا مشکل عمل ہو جاتا ہے۔ اصل مسئلہ ثقافت کے غیر مماثل ہونے کی صورت پیش آتا ہے۔ جو ترجمے کے عمل کو مشقت اور بے گاری کی سطح سے کہیں آگے، تاریخی، مذہبی اور نظریاتی اختلاف اور ان کی بنیاد پر تبدیلیوں کا عمل بنا دیتا ہے۔

مندرجہ بالا مسائل اگرچہ ہر طرح کے ادب کے ترجمے میں پیش آتے ہیں مگر غیر افسانوی ادب کے ترجمے میں مترجم کو شاید ہر قدم پر ان سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ افسانوی اور شعری ادب کے ترجمے میں ردوبدل یا سازباز کا عمل شاید اتنا خطرناک اور مہلک نہیں ہوتا جتنا غیر افسانوی ادب کے ترجمے میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ غیر افسانوی ادب کا مقصد عموماً اطلاع فراہم کرنا، اصل تصویر پیش کرنا اور حقائق کو قلم بند کر کے محفوظ کرنا ہوتا ہے۔ اس میں حقائق کی پیش کش کسی بھی اور عنصر سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ انشائیہ، سوانح، آپ بیتی (یا خودنوشت)، مکتوب خاکہ، سفر نامہ اور طنز و مزاح کا ترجمہ کسی قوم یا گروہ کے متعلق حقائق کی ترسیل بھی کرتا ہے اور ترجمے کے دوران تبدیلی حقائق کو مسخ بھی کر دیتی ہے۔ غیر افسانوی ادب کی مختلف اصناف کے ترجمے میں درپیش مسائل کی شناخت اور ان کے حل کے لیے کسی تجویز کی پیش کش سے قبل ان بنیادی عوامل سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے جن کی بدولت ترجمے میں تبدیلی آ سکتی ہے۔

ترجمے پر اثر انداز ہونے والے عوامل

آندرے لیفیور نے ترجمے کی تبدیلی کا باعث بننے والے عوامل کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی

۱۔ نظریاتی Idealogical

۲۔ ادبی/بوطیقاتی Poetological

۳۔ سرپرست عناصر Partonage[۳]

لیکن راقمہ کی رائے میں سب سے پہلا عامل جو ترجمے کو متن سے الگ بنا کر پیش کرتا ہے، خود مترجم ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ مترجم چونکہ بنیادی محرک اور ایجنٹ ہے لہٰذا اس کا ذاتی ذوق، ادبی فہم و بصیرت، اس کے حالات اور خود مترجم کی قابلیت زبان اور ثقافت سے واقفیت اور مترجم کا اپنا ثقافتی پس منظر بھی ترجمے کی تبدیلی کا باعث بن سکتے ہیں۔ لہٰذا لیفیور کے بتائے ہوئے عوامل کی تفصیل سے قبل ان تین عوامل کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو مترجم سے متعلق ہیں اور جو مترجم کو ترجمے کو متن سے الگ کرنے کی راہ پر چلاتے ہیں اور بالواسطہ طور پر ترجمے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یوں ترجمے پر اثرانداز ہونے والے عوامل کی تعداد سات تک پہنچتی ہے۔

۱۔ مترجم کا ذاتی ذوق

مترجم چونکہ اپنی مرضی سے متن کا انتخاب کرتا ہے اور اس انتخاب میں عموماً اس کا ذاتی ذوق اور پسند اور ناپسند کارفرما ہوتی ہے لہٰذا وہ کس پہلو کو ترجمے میں نمایاں کرنا چاہتا ہے اور کس سے صرف نظر کرے گا، یہ مکمل طور پر اس کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ چونکہ وہ کسی بھی تصویر کا وہ رخ پیش کرے گا جو اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ تو ممکن ہے وہ پورے کے پورے حقائق کو تبدیل کر کے رکھ دے اصل متن کی زبان سے واقفیت اور اس واقفیت کی نوعیت بھی اس تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔

۲۔ مترجم کا تعصب

اقوام اور گروہوں کے درمیان لسانی و ثقافتی دوریوں کی ایک وجہ تو قدرتی ہے مگر یہ اختلافات مذہبی، تاریخی یا سیاسی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں۔ مترجم بھی ایک انسان اور معاشرے کا ایک رکن ہوتا ہے۔ اگر چہ اسے اقلیم زبان و ادب کا عالمگیر باشندہ تسلیم کیا جاتا ہے

مگر سیاسی ومعاشرتی، یا تاریخی ومذہبی تعصّبات سے اس کے دامن کا آلودہ نہ ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ اگرچہ تعصّبات کی نوعیت بہرحال منفی ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ وابستگی بھی تعصب کی ایک صورت ہے۔ ترجمے میں تبدیلی کے پیچھے بدنیتی ہی نہیں نیک نیتی بھی کارفرما ہوسکتی ہے۔ مثلاً کوئی مترجم انگریزی کے کسی نامور ادیب کے خاکے کو اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے اس کی جنسی بے راہروی یا ازدواجی زندگی کے ذکر کو ترجمہ نہ کرے اور مقصد یہ ہو کہ اس ادیب کی عزت مشرق کے قارئین کی نگاہ میں کم نہ ہو جائے کیونکہ مشرق کے قارئین ادبی قدوقامت سے زیادہ اخلاقی قدوقامت کے لحاظ سے مقام ومرتبے کا تعین کرتے ہیں۔ یا وہ اس سوچ کے ماتحت اس تبدیلی کا مرتکب ہو کہ ایک نامور شخص کی جنسی بے راہ روی قارئین میں بے راہ روی کی ترغیب کا سبب بن کر معاشرتی اقدار کی پامالی کا سبب نہ بن جائے۔ یہ تبدیلی یا اخفاء دونوں صورتیں نیک نیتی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مگر یہ مترجم کی اپنے منصب اور فرض سے پہلوتہی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

۳۔ مترجم کا لسانی وثقافتی علم

عموماً ترجمے کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ مترجم دو زبانوں سے واقف ہو تو وہ اصل متن کو ترجمہ کرسکتا ہے۔ افسانوی اور شعری ادب کے ترجمے کی صورت میں مترجم کا ادبی ذوق اور ادبی فہم بھی ضروری قرار پاتی ہے۔ مگر غیر افسانوی ادب کے ترجمے کے لیے محض ذولسانی واقفیت ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ غیر افسانوی ادب کے ترجمے میں مترجم کے لیے لسانی وثقافتی دونوں علوم سے واقفیت ضروری ہے۔ مترجم کی بے خبری ترجمے کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہے۔ مثلاً ایک عمومی مثال ٹوسٹ تجویز کرنے کی ہے۔ ٹوسٹ تجویز کرنا مغربی تہذیب وثقافت کی ایک رسم ہے جس میں کسی محفل میں کوئی شخص دوسرے کی صحت یا اسکی خوشی کے نام ایک جام کرتا ہے۔ اردو دان طبقہ عموماً ایک ہی ٹوسٹ سے واقف ہے ،یعنی ڈبل روٹی کا ٹکڑا۔ لہٰذا غالب امکان ہے کہ بے خبر یا قدرے کاہل مترجم ٹوسٹ تجویز کرنے کو ڈبل

روٹی کا ٹکڑا تجویز کرنے کا عمل سمجھ کر ترجمے میں بھی یہی لکھ دے۔ایسا عمل نہ صرف متن کے عدم ابلاغ بلکہ غلط ترجمے کا سبب بنے گا بلکہ یہ قارئین کی گمراہی کا ذمہ دار بھی ہوگا۔

۴۔مترجم کا ثقافتی تشخص

ترجمے اور تہذیب و ثقافت کا تعلق تخلیق اور ثقافت جتنا گہرا نہ سہی لیکن اسکی مضبوطی اور اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔تہذیب اور ثقافت دونوں اپنی انفرادی اور مجموعی حیثیت میں کسی فن پارے کی تخلیق پر اثرانداز ہوتی ہیں۔تخلیق کار کی اپنی ذات اور تشخص تہذیب و ثقافت کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے کوئی درخت جڑوں کے بغیر۔ہرفن پارہ اپنی تہذیب اور ثقافت کی پیداوار اور عکاس ہوتا ہے۔ترجمہ دو مختلف زبانوں اورتہذیب و ثقافت میں رابطہ ہے۔مترجم بھی کسی نہ کسی ثقافت کا پروردہ ہوتا ہے۔اسے اسی ثقافتی روایت کے اندر رہ کر قارئین کی تہذیبی اور ثقافتی ترجیحات کے مطابق ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔عموماً ترجمہ زبان اور ثقافت ،دوسطحوں کی قربت یا دوری کی بنیاد پر ہوتا ہے۔زبان وثقافت کی قربت مترجم کے لئے آسانی فراہم کرتی ہے اور ترجمے کا عمل کافی سہل بنا دیتی ہے، کیونکہ اشتراکات کی موجودگی اسکا ترددکم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔زبان اورثقافت کی دوری کی صورت میں مترجم کو اپنے تمام تر حواس سے کام لیتے ہوئے ہر ہرقدم پرخبردار رہنا ہوتا ہے۔فن پارہ اورمتن اس سے وفاداری کا تقاضا کرتا ہے اور قارئین چونکہ ترجمے کے محرک اورمربی ہوتے ہیں لہٰذا انکی پسند و ناپسند اورقبولیت یا رد کا لحاظ کئے بغیر مترجم کا گزارہ ممکن نہیں۔اسی ثقافتی تشخص کا نتیجہ ہے کہ جس طرح دوسری زبان میں ترجمہ شدہ متن کے معانی اور مقام تبدیل ہو جاتے ہیں اسی طرح دوسری ثقافتی روایت کی بدولت متن کے معانی اور حیثیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔

۵۔ نظریاتی عوامل

ادب کے ترجمے میں درپیش مسائل میں نظریاتی عوامل میں سے چند ایک تو چند مخصوص اصناف کے ساتھ براہ راست متعلق ہیں۔مجموعی طور پر ادب کے ترجمے میں جونظریاتی مسائل

درپیش ہوتے ہیں ان کا تعلق سیاسی وتاریخی پس منظر سے بھی ہے۔ترجمہ ہمیشہ اپنے سے بہتر اور برتر زبان وادب یا ثقافت سے کیا جاتا ہے۔اگر اصل اور ترجمے کی زبان کی ثقافت یا اقوام کے درمیان مخاصمت ہوتو ترجمہ غیر جانبدار یا وفاداری کا حامل نہیں ہوگا۔اس کی ایک عمدہ مثال یورپ اور امریکہ میں اسلامی تہذیب وثقافت کو کمتر درجہ دیے جانے کی ہے۔اسلامی ادب کو کمتر سمجھنے کے نتیجے میں دو ردعمل سامنے آتے ہیں یعنی یا تو اسلامی ادب کے وجود ہی سے منکر ہو جانا اور سرے سے اس کا تذکرہ ہی نہ کرنا،اور یا پھر اس ادب کو اپنا محتاج اور کمتر سمجھ کر اسکا مربیانہ جائزہ لینا۔پہلی صورت اگر حقارت اور نفرت کا رویہ ہے تو دوسری صورت بھی کچھ مثبت عمل نہیں ہے کیونکہ اپنے ادب کو برتر اور معیاری قرار دے کر اسے کسوٹی سمجھ لینا اور اسی پر اسلامی ادب کو پرکھنا انتہائی متعصب رویہ ہے۔

نوآبادیاتی دور کے تراجم بھی اسی نظریے سے متاثر ہوتے ہیں۔نوآبادکار جب تہذیب وثقافت اور شعور کی نام نہاد مشعل اٹھائے کسی سرزمین پر وارد ہوتے ہیں تو ان کی پوری کوشش ان باشندوں پر یہ ثابت کرنے میں لگ جاتی ہے کہ ان کا زبان وادب کا سرمایہ حقیر اور بے مایہ ہے۔اہل یورپ اپنے استعماری عزائم کے ساتھ جب دنیا میں نکلے تو وہ زبان کی بطور ہتھیار اہمیت سے خوب آگاہ تھے،کیونکہ زبان پر فتح پا لینے کا مطلب ثقافت اپنے قبضے میں لے لینا تھا۔اہل یورپ آگاہ تھے کہ

> " ایک زبان دوسری زبان کو بے دخل کر سکتی، ایک زبان دوسری زبان کو شرف واقتدار سے محروم کر سکتی، ایک زبان کسی دوسری زبان کے سارے ''صنعتی سرمائے'' کو بڑی حد تک اپنی دسترس میں لاسکتی اور نئی طبقاتی اور ثقافتی شناختوں کو وجود میں لاسکتی ہے۔اسی علم کو یورپ میں جدیدیت (ماڈرنیٹی) اور جدید کاری (ماڈرنائزیشن) کے لیے استعمال کیا گیا اور اسی علم کو ایشیا وافریقہ میں یورپی استعماری تخیل نے ''کلچرل پالیٹکس'' کے لیے برتا"۔[۴]

ثقافتی سیاست کی یہ شکل بھی مترجم کو ترجمے میں تبدیلی پر مجبور کرتی ہے۔سیاسی طور پر

طاقتور اور برتر اقوام اپنی تاریخ اور اپنے ہیروز کے مقابلے میں کسی اور کو بہتر درجہ دینے کو تیار بھی نہیں ہوتے۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ وہ شعوری کوشش کے ذریعے اپنے دشمن کو پست اور ہیچ ثابت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں فٹز جیرالڈ کی مثال دی جا سکتی ہے جو عمر خیام کی رباعیوں کا کامیاب مترجم مانا جاتا ہے مگر وہ بھی اسی نظریاتی تعصب کا شکار ہے جو ایک برتر یا حاکم وقت قوم کے ذہن میں محکوموں کی وقعت کے متعلق ہوتا ہے یعنی ایک تو اس نے ترجمہ کرتے ہوئے عمر خیام کے فن اور اسلوب کی چاشنی کو منتقل کرنے کے بجائے جہاں مناسب سمجھا تبدیل کرتے ہوئے یہ جواز دے دیا کہ فارسی کے شعرا اتنے بھی شاعر نہیں کہ ان کے کلام سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے خوفزدہ ہوا جائے۔ اس کا یہ بیان عمر خیام کے ادبی مقام و مرتبے کے تعین کے بجائے دراصل اس سیاسی تہذیبی کشمکش کا نتیجہ ہے جو یورپ اور مشرق کے ممالک کے درمیان رہی اور جس کی بنیاد پر مغرب نے مشرق کو پسماندہ اور وحشی سمجھا ہے۔ یہ آزادیاں کوئی یورپی مترجم یونانی زبان و ادب کے ساتھ کبھی حاصل کرنے کا سوچتا بھی نہیں۔

۶۔ بوطیقائی عوامل

ترجمہ افکار کے ساتھ ساتھ اصناف کی منتقلی کا نام بھی ہے۔ مترجم کو درپیش عمومی مسائل میں بوطیقائی مسائل بھی ہیں۔ مثلاً ترجمے کی زبان یا ادب میں اگر وہ صنف یا اس سے مماثل کوئی صنف موجود ہے تو ترجمہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور مترجم کے لیے ایک زبان کے سرمائے کو دوسری زبان کا متبادل سانچہ عطا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر اصل متن کو ایک مکمل کائنات تصور کیا جائے تو اس کے لسانی اظہارات سے پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل مترجم دو اہم بنیادوں پر تلاش کرتا ہے یعنی ترجمے کے عمل میں اس کی تمام تر حکمت عملی کی تشکیل اس کا نظریہ اور ہدفی زبان کی بوطیقات کرتی ہیں۔

یعنی اگر اصل متن کے مواد کو شراب قرار دے دیا جائے تو اس شراب کو ایک پیانے سے دوسرے پیانے میں انڈیلنا ترجمہ کہلائے گا۔ مترجم اس شراب کو پہلے سے موجود پیانوں ہی

میں ڈالنے کا پابند ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اپنی مرضی سے کوئی نیا پیمانہ بنائے گا تو تو وہ ترجمان کے بجائے تخلیق کار قرار پائے گا۔ چنانچہ ترجمے میں تبدیلی کی زبان کے ادبی نظام کی بوطیقا میں اس صنف کا نہ ہونا، یا ان میں جگہ پانے میں ناکام ہو جانا ہے اس کی ایک واضح مثال تو عربی قصیدہ ہے جس کو مترجم انگریزی کی بوطیقا میں سمونے میں ناکام رہے اور دوسری مثال اردو میں سانیٹ اور استانزے کی ہے۔ چونکہ اردو میں ان سے مماثل اصناف موجود تھیں لہٰذا یہ دو اصناف اپنی الگ اور ممتاز جگہ بنانے میں ناکام رہیں اور ایک محدود وقت کے بعد اپنی جداگانہ شناخت نہ ہونے کے سبب غائب ہو گئیں۔

یہ بوطیقائی عوامل ادبی بھی ہیں اور ثقافتی بھی۔ مثلاً مترجم کسی بھی ادب پارے کو ترجمہ کرتے وقت اپنی ادبی بوطیقا کی کسوٹی پر پرکھے یا اپنے علم اور مطالعے میں موجود کسی صنف کا قالب دینے کی کوشش کرے گا اور وہ بھی یوں کہ اصل کی چاشنی اور ذائقہ ہر ممکن حد تک منتقل کر پائے۔ اس کی ایک مثال میرا جی کے وہ ترجمے ہیں جو انہوں نے ایڈگر ایلن پو کی نظموں کے کیے۔ پو کی خواب آلودہ ذہانت کی مناسبت سے میرا جی نے جو بحر منتخب کی وہ اس منطق کے ساتھ سنی گئی کہ اس کو خواب دیکھنے والی طبائع سے خاص نسبت ہے۔ چونکہ ہندوستانی قارئین کے مزاج کے ساتھ اس بحر کی مناسبت بھی ہے لہٰذا یہ نظمیں اردو کے مزاج میں رچ بس گئیں۔

مترجم بعض عناصر، رواجوں اور عقائد کو بھی ترجمے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جو اس کے خیال میں قارئین کی ثقافت کے برعکس یا اس کے لیے ضرر رساں ہوں گے۔ چونکہ قارئین ترجمے کی نوعیت اور انتخاب کا ایک اہم محرک ہوتے ہیں لہٰذا ان کی واقفیت اور عادت کے مطابق مسودہ لکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

> "اصل (متن) اور وہ ثقافت جس میں ترجمہ کیا جانا مقصود ہو اس کا تصور ذاتی، اس میں قبولیت پانے والی اقسام متن اور ''ثقافتی رسم تحریر'' جس کے اس زبان کے قارئین عادی ہوں یا قبول کرنے کو تیار ہوں، ان سب کا (مترجم کے) رویے پر گہرا اثر پڑتا ہے۔[۵]

چنانچہ ترجمہ ان تمام عوامل سے متاثر ہوتا ہے اور مترجم کی حکمت عملی کے تعین کا بھی باعث بنتا ہے۔

۷۔ سرپرستانہ عوامل

ترجمہ ایک ایسی مشقت ہے جو مترجم سے ہر سطح کی قربانی کا تقاضا کرتی ہے۔ادبی سطح پر اگر مترجم اس تخلیق کو اپنے نام معنون نہیں کرسکتا تو تخلیقی سطح پر وہ مصنف اور دراصل متن سے وفاداری کا ہر ممکن حد تک پابند ہوتا ہے۔ معاشی سطح پر وہ ایک دفعہ پھر قربانی دیتا ہے کہ اسے اپنے کام کے لیے مربی اور دست گیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ترجمہ چونکہ ہر ذوق کے قارئین کے لئے نہیں ہوتا بلکہ محض ان قارئین کو مدِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے جو اصل زبان کے اس مصنف اور ادب کی اس صنف میں دلچسپی رکھتے ہوں گے۔لہٰذا قارئین کے ذوق اور معیار کا خیال رکھنا مترجم کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

تراجم کا سب سے بڑا اور براہِ راست مربی تو قارئین ہی ہوتے ہیں جو مترجم کے ساتھ ساتھ ناشر کے پیشِ نظر بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ ناشران کے ساتھ ادبی معاملات سے زیادہ مالی و اقتصادی مسائل زیادہ جڑے ہوتے ہیں لہٰذا وہ جو بکتا ہے وہی چھاپنے کے قائل ہیں۔ادب کی خدمت لے دے کے اگر کسی کے پیشِ نظر ہوتی ہے تو وہ مترجم ہوتا ہے یا ادب کے سنجیدہ قارئین جن کی تعداد آٹے میں نمک برابر ہوتی ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مترجم قارئین کے عمومی مذاق کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی، سیاسی اور اخلاقی عقائد و روایات کا بھی پابند ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے تعصبات سے تو جان چھڑانے میں کامیاب ہو جائے مگر وہ قارئین کے تعصّبات ختم نہیں کر پاتا اور ان کے مطابق چلنے کا پابند ہوتا ہے۔ ۔ترجمہ ہر ذوق کے قارئین کے لیے نہیں ہوتا بلکہ محض ان قارئین کو مد نظر رکھ کر کیا جاتا ہے جو اصل زبان اور ادب کی اس صنف میں دلچسپی رکھتے ہوں گے۔ لہٰذا قارئین کے ذوق اور معیار کا خیال رکھنا مترجم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع ششم، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۸۹

۲۔ Nida, Eugene "Principals of Correspondence", "The Translation Studies Reader" Edited by Lawrence Vennti, Routledge, Lendon and New York, 2000, P.130

۳۔ Lefever, Andre, Translation Rewriting & the manipulation of Literary Fame, Routledge 11 New Fatter Lane, London EC4P, 4EE, P.11-73

۴۔ Andre, Lefever, ------- P.75

۵۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، زبان: نوآبادیاتی سیاق اور لسانی استعمارات، مشمولہ تحقیقاتِ اردو، جرنل ادارہ تحقیقاتِ اردو، جلد اول، شمارہ اول، جنوری۔ جون ۲۰۱۱ء، ص ۳۳

مجموعی جائزہ

گزشتہ ابواب میں ترجمے کی اہمیت اور ضرورت کے ساتھ ساتھ ترجمے کے مسائل و مشکلات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترجمہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے گویا پانی کی رواں لہر ہے۔ جس وقت کسی زبان وادب میں تخلیق کا عمل رک جائے، یا اس کے بہاؤ میں روانی نہ رہے اس وقت ترجمہ تخلیقی اسالیب اور افکار کا تازہ پانی لے کر آتا ہے۔ یہ ادب کی کائی زدگی اور فرسودگی کو بدیسی افکار اور لغت سے دھوڈالتا ہے۔ اگر چہ یہ ایک زبان یعنی ماخذ زبان کی موت اور اس کی تمام تر خوبیوں اور رعنائیوں سے محروم ہونے کے بعد دوسری زبان کی آرائش و زیبائش اور نمودِ نو کا عمل ہے مگر بعض الفاظ اور اظہاریوں کو دوسری زبان میں بھی منتقل کر کے اسے ایک عالمگیر لفظ اور اظہاریہ بنانے کا طریقہ بھی ہے۔ مصنف کسی ایک زبان میں اپنے تمام تر سماجی، ادبی، تاریخی اور تخلیقی پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ ایک فن پارہ تخلیق کرتا ہے اور مترجم اپنی ذات، خیالات، خلاقی اور یہاں تک کہ ملکیتی احساس کو بھی پس پشت ڈال کر تخلیق اور تخلیق کار کو اپنی زبان میں منتقل اور متعارف کرواتا ہے۔

ترجمہ ایک مشکل فن ہے کہ اس میں مترجم کو مصنف کے مطمحِ نظر کو نہ صرف خود سمجھنا پڑتا ہے بلکہ اسے دوسروں تک کسی امانت کی طرح فکر و اسلوب کی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ پہنچانا بھی ہوتا ہے۔ منتقلی کا یہ عمل بہت سی چیزوں کو پار لے آتا ہے مگر بہت سی چیزیں ماخذ زبان کے کنارے ہی رہ جاتی ہیں۔ مترجم کو زیادہ سے زیادہ چیزیں کم سے کم نقصان کے ساتھ ہدفی زبان تک ڈھونی ہوتی ہیں۔ حیرت ناک امر یہ ہے کہ صدیوں سے خدمت نوعِ انسانی میں مصروف یہ عمل کسی ستائش اور صلے کی تمنا اور پروا کیے بنا قوموں کو باہم شیر وشکر کرنے کے باوجود ابھی تک اپنی اہمیت اور ضرورت کو بھی بعض اقوام اور السنہ پر ثابت نہیں کر پایا۔ ایک وقت تھا جب شاذ ہی لوگ دیارِ غیر اور اجنبی زبانوں تک کا سفر کیا کرتے تھے۔ مگر اب ذرائع رسل و رسائل، ٹیکنالوجی اور باہمی انحصاریت کی روز بروز افزائش اور بڑھوتری کا عہد ہے۔ دنیا

وہ چھوٹا سا گاؤں بن چکی ہے جس میں اجنبی بن کر رہنے کا مطلب معدوم ہو جانا ہے۔ زبانیں اب دوسری زبانوں، ادب اور اقوام دوسرے ادب اور اقوام سے مکالمہ کیے بغیر زیادہ دیر تر ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں رہ سکتیں۔

ترجمہ چونکہ اب محض ترجمانی نہیں سمجھا جاتا لہٰذا مترجم کی حیثیت جو ایک معمول اور تابع فرمان کی تھی، بھی تبدیل ہو کر ثالث کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اب مترجم ایک زبان کے متعین نشانات سے معانی کو آزادی دلا کر انھیں دوسری زبان کے متعین نشانات میں مقید کرتا ہے۔ اور یوں وہ اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتا ہے جو متن کی اصل زبان کے مصنف اور ہدفی زبان کے قارئین کے بیچ میں زبان کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ علم کی ہمہ گیریت اور عالمگیریت کی بدولت اب مترجم ادب اور زبان کے ساتھ ساتھ علم کی مملکت کا سب سے آزاد شہری قرار پاتا ہے۔ زبانیں اور اقوام دونوں ترجمے سے نئی زندگی حاصل کرتی ہیں۔ ترجمے کی بنیادی اقسام چار ہیں یعنی علمی، ادبی، صحافتی اور مشینی ترجمہ۔

علمی ترجمہ اس علمی سرمائے کو پوری نوعِ انسان تک پہنچانے کی کاوش ہے جو سب کا مشترکہ ورثہ ہے۔ علمی ترجمہ عموماً لفظی ترجمہ ہوتا ہے یا ایک جملے کو دوسری زبان کے متبادل جملے سے ترجمہ کر لیا جاتا ہے۔ ان تراجم میں یہ لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ ترجمہ ہر ممکن حد تک ابہام سے پاک ہو۔ ایک اصطلاح کا ترجمہ جو ایک جگہ کیا جائے اسے تمام کتاب میں برقرار رکھا جائے۔ علمی ترجمہ بنیادی طور پر متبادل لفظیات کی فراہمی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مسئلہ تب درپیش ہوتا ہے جب ایک لفظ جو اصل زبان میں اصطلاحی حیثیت رکھتا ہو اور اس کے متبادل اصطلاح کی تشکیل و تخلیق میں مشکل ہو رہی ہو اور ہدفی زبان اس اصطلاح کو یوں متبادل فراہم کرنے سے قاصر رہے کہ معانی غیر واضح ہو جائیں۔ ایسے میں یا تو اسی اصطلاح کو بعینہٖ ہدفی زبان میں مستعار لے لیا جانا چاہیے اور یا پھر اس مضمون کا ایسا ماہر جسے زبان کی شد بد بھی ہو اور جو اصطلاح سازی کے فن سے بھی واقف ہو، ایسی اصطلاح تشکیل کرے جو ہر ممکنہ حد تک بلیغ ہو اور معانی کا ابلاغ کر دے۔

ادبی ترجمہ ترجمے کی مشکل ترین قسم ہے کیونکہ اس میں مصنف کی فکر ہی نہیں بلکہ اس کا اسلوب بیان اور زبان کا فنکارانہ استعمال اور چابکدستی بھی ہدفی زبان کے قاری تک پہنچانا مقصود ترجمہ ہوتا ہے۔ادبی ترجمہ نازک کام ہے اوراس کی مشکلات اور باریکیوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ترجمے کی ایک اور قسم صحافتی ترجمہ ہے جو اخبارات اور میڈیا کی ضروریات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ چونکہ اخبارات پرنٹ اورالیکٹرانک میڈیا کا کام زبان کی آرائش و زیبائش سے زیادہ حقائق کی درستگی اورترسیل سے ہے لہٰذا یہ آزاد یا کھلا ترجمہ کے طریق سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یعنی مترجم مفہوم کے ابلاغ اور ترسیل کے لیے اصل متن کے الفاظ میں جہاں اور جیسا چاہے۔تبدیلی لے آئے مگر بنیادی حقائق اور اطلاع کو مجروح نہ ہونے دے۔ ترجمہ کرتے ہوئے صحافتی مترجم کو ماخذ زبان کے لفظیات اور پیرایۂ اظہار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اسے معانی اور مفاہیم کو برآمد کرنے اوران کی ترسیل سے تعلق ہوتا ہے۔ چونکہ زیادہ تر نیوز ایجنسیاں انگریزی میں خبر جاری کرتی ہیں اور پھراس کواردو میں ترجمہ کر کےنشر کیا جانا ہوتا ہے۔

لہٰذا صحافتی ترجمے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔خبر کوفوری طور پرنشر کیا جانا ہی اس کی خوبی اور غایت ہے لہٰذا مترجم کے پاس نہایت کم وقت ہوتا ہے جس میں اس کوخبر ترجمہ کر کے دینی ہوتی ہے۔ لہٰذا مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ لغت سے آشنا ہو نیز اس کی معلومات عامہ بھی شاندار ہو تا کہ اشیاء اور مقامات کے ناموں کو ترجمہ کرتے وقت ابہام یا مضحکہ خیزی نہ پیدا ہو۔ اخباری یا صحافتی مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ سادہ، سہل اور رواں ترجمہ کرے تا کہ خود بھی آرام سے رہے اور قاری کو بھی مشقت سے بچا سکے۔موجودہ دور کمپیوٹر کا دور ہے اور ترجمے کی اہمیت کے پیش نظر مشینی ترجمہ کے میدان میں اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ترجمے کے نت نئے سافٹ ویئرز دھڑا دھڑ بن رہے ہیں۔ زبانیں اپنا سرمایہ کمپیوٹرائزڈ کر رہی ہیں تا کہ وہ گلوبل ولیج کے باقاعدہ ارکان بن سکیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ مشینی ترجمہ عام زندگی کے سیدھے سادے بول چال کے مکالموں کو تو ترجمہ کر سکتا ہے، لیکن ادب کے ترجمے میں اس

کے عمل دخل اور مہارت کا سوال غور طلب ہے۔ ادب انسانی دماغ کی پیچیدگیوں اور احساس و اظہار کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ زبان کے فنکارانہ استعمال کی صورت ہے۔ کمپیوٹر یا کوئی بھی مشین بعض الفاظ کے متبادل لفظیات تو فراہم کر سکتی ہے مگر اظہار کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں کا ایسا شعور جس میں تخلیقی عنصر بھی شامل ہو، مشین کے بس کی بات نہیں۔ کمپیوٹر مشین ہے اور مشین اس احساس کو محسوس کر سکتی ہے اور نہ ہی منتقل کر سکتی ہے جو انسان کو تخلیق پر اکساتا ہے۔ یہی خلاقی انسانی ذہن کو مشینوں سے برتر اور پراسرار بناتی ہے۔

ترجمہ آسان کام نہیں۔ مترجم کو اصل زبان کا ذائقہ اور چاشنی بھی حتی الوسع ہدفی زبان میں منتقل کرنی ہوتی ہے اور ہدفی زبان کی بوباس اور مجموعی نظامِ فکر وفن میں اس کو یوں منتقل کرنا ہوتا ہے کہ یا تو وہ اس کے ادبی وفکری و معاشرتی نظام کا حصہ بن جائے اور یا پھر اس زبان کے فکر وفن کی آزمائش یوں کرے کہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک مثبت امتحان ثابت ہو۔ چونکہ ادب کوئی خطِ مستقیم نہیں بلکہ یہ اپنی نوعیت اور اسباب وعلل و اثرات کی نوعیت کے لحاظ سے نہایت گنجلک اور پیچیدہ عمل ہے۔ لہٰذا اس کے ترجمے میں بھی زیادہ سے زیادہ عوامل اور باریکیوں کو ترجمہ کر پانا مترجم کا مطمحِ نظر ہوتا ہے اور اسی بناء پر نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔

ہر فن پارہ اپنے عہد، سرزمین، مصنف، ادبی نظام اور فکر وفن کے ارتقائی مراحل کا عکاس ہوتا ہے۔ گویا وہ ایک ایسی تصویر ہے جو اس عہد کے شعور اور تہذیب کی عکاس ہے اور تہذیبوں اور اقوام کے درمیان فنکارانہ ابلاغ کی واحد صورت ہوتی ہے۔ مزید برآں یہ کسی ہدفی زبان کے فکر وفن کا امتحان بھی ہوتی ہے۔ اگر ترجمہ کرنے والی زبان کسی فکر یا پیرایۂ اظہار کو متبادل لفظیات اور پیرایہ فراہم نہیں کر سکتی تو یہ دراصل اس کے لفظیات اور پیرایہ ہائے اظہار کی نئی جہات اور آفاق کی تلاش کو مہمیز بھی ہے۔ مترجم اس مرحلے پر اپنی زبان کو کھنگالتا اور اس کی پرکھ پرچول کرتا ہے اور اس چیلنج سے نمٹنے کے راستے ڈھونڈنے میں لگ جاتا ہے۔ ادبی متون کی ہمہ گیر و ہمہ جہت اہمیت کے پیش نظر ان کے ترجمے کی راہ میں حائل مسائل بھی بے شمار ہیں۔ یہی مسائل اس مقالے میں شعری، افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے ذیل میں زیر

بحث لائے گئے ہیں۔اس باب میں انھی مسائل کی ایک مجموعی فہرست اور اس سے نبرد آزما ہونے کی تکنیک زیرِ بحث لائی جائے گی۔

جان ڈرائیڈن نے ترجمے کے تین طریقے یعنی لغوی، معتدل اور خیالات کی ترسیل بیان کیے جبکہ ونے اور ڈاربلنٹ نے محض دو طریقے یعنی راست اور Oblique ترجمہ قرار دیے اور اس کے ذیل میں سات حکمت عملیاں بھی بیان کیں جن میں الفاظ مستعار لینا، الفاظ کی ظاہری شکل مستعار لینا، لغوی ترجمہ، ایک جز و کلام کا دوسرے جز و کلام سے تبدیل کر دینا، بات کو با اندازِ دگر کر دینا، ہم پلہ یا مساویت، اور ترمیم شامل ہیں۔

جبکہ انتونی برمن نے ترجمے کے عمل کو بارہ حکمت عملیوں یا رجحانات میں تقسیم کیا۔ ان کے مطابق ترجمہ کسی بھی فن پارے کو مختلف سطحوں پر توڑنے اور پھر اسی توڑنے کی مختلف حکمت عملیوں کے نظام کا نام ہے۔ ان بارہ حکمت عملیوں یا رجحانات میں متن کی تاویل، وضاحت، اس کی توسیع اور توقیر کے ساتھ ساتھ ماہیتی، فقیر سازی، مقداری فقیر سازی، آہنگ کی تباہی، اہمیت کے زیر سطحی نیٹ ورک کی ٹوٹ پھوٹ، لسانی بنت کی تباہی، مقامی نیٹ ورک کا خاتمہ یا ان کو بدیسی بنانے کا عمل، تراکیب اور محاوروں کی توڑ پھوڑ اور زبانوں کے تراکیب کی معدومیت شامل ہیں۔

دو اہم سوالات کا جواب دیے بغیر فنِ ترجمہ کے مباحث نامکمل رہتے ہیں، مترجم کون ہو؟ اور کیا ترجمے کا کوئی معیار مقرر کیا جا سکتا ہے؟ یعنی کیا کوئی بھی ایسا شخص جو زبانوں کی واقفیت رکھتا ہو مترجم بن سکتا ہے یا ترجمہ کوئی ایسی خداداد صلاحیت ہے جو چنیدہ لوگوں کو ہی حاصل ہوتی ہے؟ ترجمہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تخلیق کے بہت قریب ہونے کے باوجود تخلیق کے مرتبے پر فائز نہیں ہو پاتا۔ لیکن اس عمل کی پیچیدگیاں اسکو محض ذہنی قلابازیوں کا عمل بھی نہیں رہنے دیتیں۔ مجبوراً ہمیں اسکو فن کہنا پڑتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محض زبان کی مہارت کسی کے کامیاب مترجم بننے کی ضامن نہیں بن سکتی۔ زبان سیکھنے کی مہارت اور الفاظ کے متبادلات کی فراہمی میں تیزی ہر دماغ کی صلاحیت نہیں ہے، یہ صلاحیت قدرت کی ودیعت

کردہ ہوتی ہے۔اس صلاحیت کو جلا بخشنے کے لئے تربیت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ طلباء میں زبان کی مہارت اور ذوق کی شناخت کے بعد باقاعدہ انکی تربیت کی جائے۔انھیں ترجمے کی تکنیک اور مہارتیں سکھائی جائیں۔ترقی یافتہ مما لک میں ترجمہ ایک مہارت اور شعبہ علم کے طور پر پڑھایا جاتا ہے،جس کی بدولت وہاں مترجم بھی اسی طرح تیار ہوتے ہیں جیسے دیگر پیشہ ور۔اسی طرح انفرادی مہارتوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر علمی،ادبی اور صحافتی مترجم تیار کئے جا سکتے ہیں۔

کیا ترجمے کا کوئی معیار متعین کرنا ممکن ہے؟اگر ہاں تو اس کے پیرا میٹر کیا ہوں گے؟کیا ترجمے کے لئے کوئی مخصوص زبان،اسلوب یا لغت مقرر کر کے اسے حتمی پیمانہ قرار دیا جا سکتا ہے؟یہ ایک طویل بحث اور دلائل کے لمبے سلسلے کا آغاز ہوسکتا ہے۔لیکن سرِ دست اس کو مختصراً یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ جس طرح تخلیق کو کسی حد بندی یا حتمی پیمانے کا پابند نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ترجمہ بھی بنیادی اصولوں اور معروضی پیمانوں کی حد بندی میں تو لایا جا سکتا ہے لیکن کوئی ایسا جامع اور حتمی اصول یا کسوٹی مقرر نہیں کی جا سکتی،جو ہر ترجمے کے لئے کام آئے۔کسی بھی ترجمے کے مسائل میں لسانی،تہذیبی،بوطیقائی اور اسلوبیاتی مسائل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ترجمے پر اثرانداز عوامل میں خود مترجم،قاری،سرپرست عناصر،بوطیقائی عوامل اور اسلوبیاتی حد بندیاں شامل ہیں۔یہ لسانی،معاشرتی،اخلاقی،تہذیبی مسائل اور حدبندیاں سامنے رکھتے ہوئے کسی متن کا معیار مقرر نہیں ہوتا۔البتہ ہر ترجمے کو ایک کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے اور وہ کسوٹی ہے ترجمے کے مقاصد۔ترجمے کے مقاصد ترجمے کی کامیابی کی کسوٹی ہوتے ہیں۔اگر ترجمہ اپنے مقاصد پورے کرتا ہے تو اسے کسی حد تک کامیاب ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔البتہ کسی بھی ترجمہ شدہ متن کا واضح،معنوی طور پر درست اور مصنف کے اسلوب کا عکاس ہونا ضروری ہے۔شاید ترجمے کا یہی ایک معیار مقرر کرتے ہوئے ہم ترجمے کی راہیں کھول سکتے ہیں۔یہ امر تو طے شدہ ہے کہ کوئی بھی ترجمہ درست اور حتمی نہیں ہوتا،وقت،علاقے اور مقاصد کے اعتبار سے تبدیلی یا بہتری کی گنجائش تو ہمیشہ باقی رہتی ہی ہے۔

ترجمے کا عمل انسان کے جتنا ہی قدیم ہے مگر با قاعدہ طور پر ہوریس اور سسرو نے مغرب میں ترجمے کا آغاز کیا۔ مغرب میں عیسائیت کی اشاعت نے ترجمے کو مذہبی رخ عطا کر دیا جس کو روکنے کے لیے سخت سزاؤں کے نفاذ کے بعد بھی یہ سلسلہ رک نہ سکا۔ جون وائیکلف نے لاطینی سے انگریزی میں جبکہ ولیم ٹنڈل نے انجیل کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کے ساتھ ساتھ اسے شائع بھی کیا۔ پرنٹنگ پریس کی بدولت ترجمے کی رفتار میں تیزی آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر مصنف اور شاعر نے ترجمے پر توجہ دی اور اب یہ عالم ہے کہ سمٹتے ہوئے فاصلوں نے ترجمے کی اہمیت اور عمل کو کہیں زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ ترجمہ اپنے ارتقائی ادوار میں مختلف نظریات کے زیر اثر ہوتا رہا ہے۔ اور یہ نظریات ترجمے کے طریقوں اور مقام پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ ترجمے کا عمل محض طریقہ ہائے ترجمہ کی اطلاقی شکل ہی نہیں ہے بلکہ بدلتے ہوئے معاشی و معاشرتی، سیاسی و ثقافتی منظر نامے میں اس کو اپنی تشکیل نو بھی کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمے کا عمل متحرک ہے ساکن یا جامد نہیں۔ کوئی بھی ترجمہ حتمی یا آخری قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کتابیات

کتب

۱۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر (مرتب)، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع ششم، ۲۰۰۶ء

۳۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

۴۔ مشتاق احمد یوسفی، خاکم بدہن، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۴ء

۵۔ نثار احمد قریشی (مرتب)، ترجمہ: روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۶۔ خلیق انجم، ڈاکٹر (مرتب)، ترجمہ نگاری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء

رسالہ

۱۔ تحقیقات اردو جرنل، ادارہ تحقیقاتِ اردو، راولپنڈی، جلد اول، شمارہ اول، جنوری۔ جون ۲۰۱۱ء

انگریزی کتب

Andre Lefever, "Translation: Rewriting and the Manipulation of Literary Fame", Routledge, London.

Christina Schaffner, Sussan Bassnet, "Political Discourse, Media and Translation", Cambridge Scholars Publishing, Newcastle, 2010

Defeng, Li, "Translators as well as Thinkers: Teaching of

"Great World Texts: A Programme of the Centre for the Humanities, University of Washington, 2012

Journalistic Translation in Honk Kong", http://id.erudit.org

Evan Itemar Zohar, "Poly System Studies", Poetics Today, 1990

Jeremy Munday, "Introducing Translation Studies", Routledge, Oxen, 2001

Lawrence Venuti (Editor), "The Translation Studies Reader", Routledge, 2003

Mona Baker, "In Other Words: A Course book on Translation, Routledge

Susan Bassent. "Translation Studies", Routledge, London, 3rd Edition, 2002

T.S. Eliot, "Tradition and Individual Talent"

Tim Ennis, "Translation and Discourse", M.A. Translation Studies

"Journal of the International Association of Buddist Studies", 1997

www.zemtv.com/2013/07/12/hasb-e-haal

www.progressivemuslims.org